کشمیر کے تیرہ ۱۳ اُردو افسانے
مُرتّبہ
ڈاکٹر شمیم احمد
محمد مظہر امین

کشمیر کے تیرہ
اردو افسانے

-: مرتبین :-

ڈاکٹر شمیم احمد

محمد مطہر امین

کتاب : کشمیر کے تیرہ اردو افسانے

مرتبین : ڈاکٹر شمیم احمد، محمد مطہر امین

مطبع : ایچ ایس آفسیٹ پرنٹرز، نئی دہلی۔

تعداد : 500

ناشر : ایم۔ آر۔ پبلی کیشنز

10 میٹروپول مارکیٹ، 2724-25 کوچہ چیلان، دریا گنج، نئی دہلی

Kashmir ke Terah Urdu Afsane

by

Dr. Shamim Ahmed & Muhammad Mutahhar Amin

835, Abid Building, Ballimaran, Delhi-110006

Cell: 09811320531 E-mail: dr.shamimahmed@yahoo.com

یہ کتاب قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کے مالی تعاون سے شائع ہوئی

ISBN: 978-93-83282-30-2

Edition :2014

Price: **₹ 150/-**

Library Edition: **₹ 240/-**

Printed & Published by

M. R. Publications

(Printers, Publishers, Book Sellers & Distributors of Literary Books)

10 Metropole Market, 2724-25 First Floor
Kucha Chelan, Daryaganj, New Delhi-110002

Cell: 09810784549, 09873156910 E-mail: abdus26@hotmail.com

انتساب

نانا محترم مفتی نورالدین واعظ

اور

دادی محترمہ تاجہ بیگم

کے نام

ترے حلم ومحبت کی نہیں ہے انتہا کوئی
نہیں ہے تجھ سے بڑھ کر سازِ فطرت میں نوا کوئی

- محمد مطہرامین

فہرست

............☆☆☆............

تبریک

کشمیر ہر اعتبار سے ستائش کا سزاوار ہے۔ حسن و جمال کے ان گنت مرقعے مظاہرِ فطرت کے پہلو میں پرورش پا کر صورت گری کی حسین ترین مثال بن جاتے ہیں۔ ذی روح اور متحرک پیکروں کا خاموش وادی کی پرسکوت فضا سے ہم آہنگ ہونے کا منظر بھی دل کشی کا سبب بن جاتا ہے۔ تخلیق کی ہر چھوٹی بڑی شے اپنے وجود کے اعتراف کے لئے کائنات کی دوسری شہادتوں کی منتظر رہتی ہے۔ انسانی صناعی کی خوبصورتی مظاہرِ فطرت کی ہم نشینی سے ابدیت کے پیکروں میں ڈھل جاتی ہے۔ یہ مشاہدہ کشمیر کی نسبت سے کیا جاسکتا ہے۔ کائنات میں مرکزِ تخلیق انسان ہے۔ دوسری تخلیقات اس کے طفیل یا تزئین کے لئے ہیں۔ عرضِ ہنر کے اس جوہر کو ذہن میں رکھیے تو پہلوئے کشمیر سے پیدا ہونے والا ہر فنِ لطیف اس خطۂ زمین کا آئینہ خانہ نظر آئے گا۔ شرح و بیاں سے قطع نظر صرف ادبی تخلیقات پیشِ نگاہ ہوں تو آس پاس کی عکاسی کے ساتھ روح و جگر میں برپا محسوسات کی آتشِ سوزاں بھی بہت نمایاں نظر آئے گی۔ تمام فن گرد و پیش کی فضاؤں کے اظہار کے لئے فطرتاً مجبور ہیں۔ کشمیر کے اردو ادب میں وہاں کے آثار و احساس کی بڑی فراوانی موجود ہے۔ شاعری ہو یا داستان سرائی کے مختلف وسیلے، سب میں یہ محرکات ملتے ہیں۔

گذشتہ کئی دہائی سے کشمیر نے تخلیقی ادب میں اضافے کئے ہیں۔ شعری اکتساب کے بعد افسانوی ادب کا سرمایہ خاصا گراں ہے۔ بہ قول علامہ شبلی علمی کم مائیگی کے زمانے میں قصہ اور کہانیوں کا عروج ہوتا ہے۔ افسانوی تخلیق کے کئی مجموعے منظرِ عام پر آئے۔ ان میں بہترین فن پاروں کے انتخاب کی ضرورت تھی تاکہ شائقین کی تشفی اور نصابی ضرورتوں کی تکمیل ہو سکے۔ اردو ادب میں انتخاب کی ایک سلسبیل ہے۔ شاعری کے ساتھ افسانوں کے

کئی انتخابات اور خود فن کاروں کے انتخاب پر خاص توجہ رہی ہے۔ تیرہ افسانے اور تیرہ نظمیں فالِ نیک کے طور پر مقبول ہوئیں۔ ڈاکٹر شمیم احمد کو آفریں ہو کہ انہوں نے کشمیر میں لکھے گئے افسانوں کے انتخاب پر توجہ دی۔ اس انتخاب میں کشمیر کے مناظر کے ساتھ محسوسات میں ہیجان برپا کرنے والے جذبات کی دنیا بھی آشکار ہے جس سے وہاں کا ہر پیر و جواں دوچار ہے۔ حالاں کہ اس دہکتے ہوئے آتش کدہ کا اظہار اشاروں اور علامتوں کے بین السطور ہی ہو سکا ہے۔ پھر بھی دیدۂ بینا کے لئے اس میں بہت کچھ ہے۔ ڈاکٹر شمیم احمد نے زبان و بیان کی بعض کوتاہیوں کی طرف اشارہ کیا ہے۔ اردو کے افسانوی ادب کی یہ ایک تخلیقی کوتاہی ہے جو مختلف علاقوں کے افسانہ نگاروں میں عام ہے۔ اس سے قطع نظر حسن انتخاب میں وادیٔ گل پوش کی رنگین نوائی کے ساتھ دل دوز حکایتیں بھی شریک غمِ دوراں اور وجہِ اضطراب بن گئی ہیں۔

عبدالحق

۱۸؍جنوری ۲۰۱۴

تقدیم

اردو افسانہ اپنی عمر کے سو سال پورے کر چکا ہے۔ اس ایک صدی کے سفر میں اردو افسانہ میں بہت سے موضوعاتی اور ہیئتی تجربات ہوئے، کبھی بیانیہ پر زور دیا گیا کبھی موضوع کو اہمیت دی گئی، کبھی علامت اور تجرید کو افسانے کا حصہ بنایا گیا لیکن زندگی انہیں افسانوں کو نصیب ہوئی جو افسانہ کے فن پر کھرے اترے۔ اردو افسانہ کی ابتدا پریم چند یا ان سے کچھ قبل ہوئی لیکن بہت جلد اردو میں افسانہ ہندوستان کے ہر گوشے میں لکھا جانے لگا۔ آج بھی ہندوستان کے تقریباً بیشتر صوبوں میں اردو کے افسانہ نگار موجود ہیں۔ دہلی اور اتر پردیش کے علاوہ بہار، مہاراشٹر، بنگال، آندھرا پردیش، پنجاب، مدھیہ پردیش غرضیکہ ہر جگہ اردو میں افسانہ لکھا جا رہا ہے۔ کشمیر ایسا صوبہ ہے جہاں کی سرکاری زبان ہی اردو ہے، اس لحاظ سے کشمیر میں اردو کی ہر صنف کا معیار بہتر ہونا چاہئے۔ کشمیر میں اردو افسانہ کی روایت بھی کافی پرانی ہے۔ کرشن چندر اور سعادت حسن منٹو کا تعلق بھی کشمیر سے رہا۔ آج بھی کشمیر میں اردو افسانہ فروغ پا رہا ہے۔ اردو افسانہ کی تاریخ پریم ناتھ در، حامدی کشمیری، نور شاہ، ترنّم ریاض، اور دیپک بدکی وغیرہ کے افسانوں کو کبھی نظر انداز نہیں کر سکتی۔ کشمیر میں لکھے افسانوں میں ایک خاص ماحول اور اسلوب نظر آتا ہے، وہاں لکھے گئے افسانوں میں قدرتی حسن کے مناظر کا عکس بھی ہے اور وہاں کے افراد کا درد بھی جھلکتا ہے۔

ڈاکٹر شمیم احمد نے پہلی بار کشمیر کے نمائندہ افسانوں کا انتخاب ترتیب دیا ہے۔ یوں تو ڈاکٹر شمیم خصوصاً اقبالیات کے شناس ہیں لیکن یہ انتخاب کر کے افسانوی ادب سے بھی اپنی وابستگی کا اظہار کیا ہے۔ کشمیر کے افسانوں کا انتخاب اس بات کی طرف اشارہ کرتا ہے کہ اقبال اور کشمیر کے تعلق ہی نے انہیں اس جانب متوجہ کیا ہے۔ اس انتخاب میں تیرہ

افسانے شامل ہیں۔ پریم ناتھ پردیپ سے لے کر غلام نبی شاہد تک کے افسانے اس میں ہیں۔ یہ سبھی افسانے کشمیر کی افسانوی ادب میں نمائندگی کو ظاہر کرتے ہیں۔ اس کتاب کا مقدمہ قابل توجہ ہے۔ شمیم احمد نے کشمیر کے حوالے سے منتخب افسانوں کا تجزیہ کر کے کتاب کی اہمیت کو بڑھا دیا ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ یہ انتخاب قدر کی نگاہ سے دیکھا جائے گا۔ اس کاوش کے لئے میں صمیمِ قلب سے ڈاکٹر شمیم احمد کو مبارکباد پیش کرتا ہوں۔

پروفیسر ابن کنول

شعبۂ اردو، دہلی یونیورسٹی

۲/جنوری ۲۰۱۴ء

پیش لفظ

جموں و کشمیر کو یہ اعزاز حاصل ہے کہ یہ ہندوستان کی واحد ریاست ہے جہاں اردو کو باقاعدہ سرکاری زبان کا درجہ حاصل ہے۔ ملک کی دیگر ریاستوں کے مقابلے یہاں اردو تعلیم و تدریس کا سلسلہ زیادہ باقاعدگی اور باضابطہ طور پر جاری ہے۔ اتنی بڑی آبادی کے اردو تعلیم سے بہرہ ور ہونے کا لازمی نتیجہ یہ ہونا چاہئے تھا کہ یہاں بڑی تعداد میں اردو نثر و نظم کی تخلیق ہوتی اور یہاں سے وابستہ ادیب و شعرا کو ملک و بیرون ملک خصوصی امتیاز حاصل ہوتا۔ تاہم عجیب بات یہ ہے کہ اوّل الذکر خواہش کی تکمیل تو بہر حال ہوئی لیکن آخرالذکر آرزو پوری نہ ہوئی اور کشمیر کا اردو ادب زیادہ مقبول نہ ہو سکا۔ حالانکہ ہماری تمام بڑی اصناف، غزل، نظم، ناول اور افسانے میں اہل کشمیر طبع آزمائی کرتے رہے۔

کشمیر میں افسانہ نگاری کی روایت باقی ہندوستان سے قدرے دیر میں شروع ہوئی۔ مانا جاتا ہے کہ جموں و کشمیر کے پہلے افسانہ نگار پریم ناتھ پردیسی تھے، جنہوں نے 1932 سے افسانے لکھنے شروع کیے۔ اس سے پہلے وہ شاعری کی طرف متوجہ ہو چکے تھے۔ کچھ ماہرین کی رائے ہے کہ پردیسی سے پہلے تیرتھ کاشمیری اور چراغ حسن حسرت افسانے لکھ چکے تھے تاہم اس بات پر سب کا اتفاق ہے کہ ان دونوں حضرات کے اسلوب سمٹے ہوئے تھے جب کہ پردیسی نے افسانے کے فن کو نکھارا اور اسے تنوع عطا کیا۔

ریاست میں افسانے کے ارتقا کا دور سماجی اور سیاسی تبدیلیوں کا دور بھی تھا۔ 1947 میں شخصی نظام حکومت سے آزادی ملی اور کشمیر دو حصوں میں منقسم ہو گیا۔ دیگر اور نقصانات کے ساتھ ساتھ ادب بھی اس کی گرفت سے محفوظ نہ رہ سکا۔ کئی افسانہ نگار ہجرت کر کے پاکستان چلے گئے اور کئی ادیب معاش کی تلاش میں ریاست سے کوچ کر گئے۔ ان میں

قدرت اللہ شہاب، کوثر سیمابی، ٹھاکر پونچھی، پریم ناتھ دراور کشمیری لال ذاکر قابل ذکر ہیں۔
اس سانحے سے کشمیر کی ادبی دنیا پر خاصا منفی اثر پڑا۔ ابھی اس صورتِ حال سے پوری طرح ابھر بھی نہ پائے تھے کہ 1989 سے نئے مسائل نے اپنے قدم جما دیے اور اتحاد و اتفاق کی قدروں کو تاراج کرنے کی کوشش کی گئی۔ اردو کا ادبی حلقہ بھی اس سے بے حد متاثر ہوا۔ اس دور کے اہم افسانہ نگاروں کے یہاں وادی کی صورتِ حال اور سماج کا کرب تلخ انداز میں بیان ہوا ہے۔ عمر مجید، غلام نبی شاہد، ترنم ریاض اور شمیم احمد شمیم کے افسانے اس امر کی دلیل ہیں۔

کشمیر میں افسانہ نگاری کی روایت بڑی مستحکم ہے اور یہاں بڑی تعداد میں افسانے لکھے گئے ہیں۔ ہماری خواہش تھی کہ ہم زیادہ سے زیادہ افسانہ نگاروں کو اس انتخاب میں جگہ دیں لیکن موضوع اور مواد کا ایک معیار قائم کر کے ہم نے جن افسانوں کا انتخاب کیا وہ آپ کے سامنے ہے۔

ہم اُن سبھی افسانہ نگاروں کے شکر گزار ہیں جنھوں نے بہ خوشی ہمیں اپنے افسانے اس انتخاب میں شامل کرنے کی اجازت دی۔ میں ذاتی طور پر سلیم سالک صاحب کا شکریہ ادا کرنا چاہتا ہوں کہ اُن کے مفید مشورے کتاب کی ترتیب میں شامل رہے۔ استادِ محترم ڈاکٹر شمیم احمد کا شکریہ مجھ پر واجب ہے کہ اُن کی شفقت اور محبت نے مجھے اس لائق سمجھا کہ مجھے اس کتاب میں بطور مرتّب شامل ہونے کا موقع ملا۔ میں اپنے والد محمد امین شاہ، والدہ بشیرہ پروین، ہمشیرہ مازلہ امین اور مُشفق و مہربان سید وقار بخاری کا بھی شکر گزار ہوں کہ انھوں نے ہر طرح میری حوصلہ افزائی فرمائی۔

محمد مُظہر امین
سینٹ اسٹیفنز کالج
۱۷ر دسمبر ۲۰۱۴ء

مقدمہ

وادی کشمیر کا نام آتے ہی ذہن میں حسن و جمال کا تاثر ابھرتا ہے۔ ایسا حُسن جو ہر قسم کی کثافت سے بالکل پاک ہو۔ پُر فضا مقامات، ٹھنڈی ہوائیں، دودھیا برف، سر سبز میدان، رنگ برنگے باغات، ڈل جھیل اور اس میں تیرتے شکارے اور سرخ و سفید چہرے۔ جمال کے یہ پیکر ہر ذی روح کو اپنے سحر میں گرفتار کر لیتے ہیں۔ اسی عالم سحر میں انسان اسے اہل دنیا کے لئے خصوصی عطیۂ خداوندی سمجھتا ہے۔ اس کی تعریف و توصیف میں اشعار کہتا ہے۔ اس کے دل فریب مناظر کو لفظوں میں بیان کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ اس کے پس منظر میں ادیب ایسی کہانیاں بنتا ہے جن میں اسے منظر نگاری کا بھر پور موقع حاصل ہو۔

ہمارے ادیبوں اور شعرا نے کشمیر کو موضوع بنا کر فیضانِ قدرت کی تو خوب داد دی لیکن اہلِ کشمیر کی سخت زندگی کو درخورِ اعتنا نہیں سمجھا۔ اُن کے مسائل کی طرف توجہ نہیں کی یا کی بھی تو بہت کم۔ شاید اس لیے بھی کہ میدانی علاقوں میں رہنے والے ہمارے ادیب دشوار گزار پہاڑوں پر زندگی بسر کرنے والوں کے مسائل کا بر موقع مشاہدہ نہیں کر پاتے اور نہ انہیں ان کی تکالیف کا حقیقی اندازہ ہوتا ہے۔

اردو کے کئی بڑے ادیب اور شاعر ایسے ہیں جن کے اجداد کا تعلق کشمیر سے ثابت ہے لیکن عجیب بات یہ ہے کہ خود کشمیر کے کسی شاعر یا ادیب کو اردو میں کوئی بڑا مقام اب تک حاصل نہیں ہوا۔ کشمیر کا اردو ادب اپنے اُس مقام و مرتبے سے محروم ہی رہا جس کا وہ حقدار ہے۔ کافی عرصے سے یہ بات ذہن میں تھی کہ اس طرف توجہ کیے جانے کی ضرورت ہے۔ ادھر کچھ برس سے کشمیر کے طلبہ کی تربیت کے دوران وہاں کے نامور ادیب اور شعرا پر گفتگو ہوئی تو خیال آیا کہ کشمیری ادیبوں کے تحریر کردہ افسانوں کا ایک انتخاب کیا

جائے۔ یہ خیال بھی ذہن میں تھا کہ افسانے ایسے ہوں جن میں کشمیر کے حسین مقامات کے بجائے اہل کشمیر کی دشواریوں اور تکالیف کو موضوع بنایا گیا ہو۔ یوں بھی وہ تین عشروں سے کشمیر کا لفظ جس شدت اور حرارت سے عبارت رہا ہے اس نے اہل کشمیر کی زندگی کو آشوب زدہ بنا دیا ہے۔ میں نے اپنے عزیز شاگرد محمد مطہر امین سے مشورہ کیا کہ کشمیری ہونے کے باعث اہل کشمیر کے بیشتر افسانے ان کے مطالعے میں تھے اور انہیں کہانیوں کے انتخاب کا ایک خصوصی ذوق بھی تھا۔ چنانچہ ہم دونوں نے کشمیر کے اردو افسانوں کا ایک انتخاب تیار کیا ہے اور کوشش یہ کی کہ کشمیر میں افسانے کے آغاز سے تاحال ہر عہد کے افسانہ نگار کی نمائندگی ہو۔

اس انتخاب میں محض تیرہ افسانے ہیں۔ قارئین کی دلچسپی کے لئے ان تمام تیرہ افسانوں کا مختصر تعارف پیش ہے۔

پریم ناتھ پردیپ کا افسانہ ڈھول، تہذیب و ثقافت سے سروکار رکھتا ہے اور کئی اعتبار سے یہ کشمیر ہی نہیں ہندوستانی تہذیب اور ہندوستانی اخلاق و آداب کا بھی آئنہ دار ہے۔ اب سے پچاس ساٹھ برس پہلے خواتین کی تصویریں لینا اور انہیں منظر عام پر لانا نہ صرف یہ کہ معیوب اور ناپسندیدہ تھا بلکہ ہماری تہذیب ایسی عورت کے کردار پر انگلی اٹھانے سے بھی گریز نہ کرتی تھی۔ دوسری جانب یہ افسانہ عام ہندوستانی کی غربت کا دل دوز نقشہ بھی کھینچتا ہے کہ گذشتہ آٹھ برس سے ایک عورت زندگی کی سب سے بڑی خوشی اولاد سے محروم ہے اور یہ وہ محرومی ہے جس کو دور کرنے پر صرف پانچ روپے خرچ ہونے ہیں۔ یہ افسانہ کشمیر کے پُر فضا لیکن گھٹے گھٹے ماحول کی بھرپور عکاسی کرتا ہے۔

برف کا کھیل کسے پسند نہیں، دور دور سے سیاح وادیِ کشمیر میں برفباری کا لطف لینے آتے ہیں۔ لیکن یہی برف جب اپنا کھیل کھیلنے پہ آتی ہے تو اس کے ستم ظریف ہاتھ جسم اور جان کو ایک دوسرے سے جدا کر دیتے ہیں۔ کاغذ کا واسدیو دل دہلا دینے والی کہانی ہے جس میں کشمیر کی پہاڑیوں کا حسن، چشموں کی آب و تاب، آسمان کی دلکشی کے مناظر سب

کچھ ہے۔ لیکن پورے افسانے میں دکھ، غم اور المنا کی کی ایک زیریں لہر قاری کے دل کو اپنے ہاتھ میں لیے سفر کرتی ہے اور بالآخر ایک ایسے مقام پر لا کر چھوڑتی ہے کہ کشمیریوں کی زندگی کی تکالیف قاری کی اپنی تکلیف بن جاتی ہے۔

اختر محی الدین کی کہانی پانڈرچ عام کہانیوں سے مختلف اور محض ایک کردار کے اردگرد گھومتی ایک طویل کہانی ہے۔ کسی ایک کردار میں اتنی کشش پیدا کر دینا کہ وہ قاری کو اپنے ساتھ باندھے رہے، قاری کا تخیئل اسے اس مقام کی سیر پر آمادہ کردے جہاں اس کردار کے قدم پڑتے ہوں، افسانہ نگار کی مہارت کی دلیل ہے۔ 1950 اور 1960 کے عشروں میں افسانہ کے فن میں جو تجربے کئے گئے، ان میں ایک خاص تجربہ یہ ہے کہ کہانی کو کسی سیدھے سادے منطقی انجام پر لاکر ختم کرنے کے بجائے ایک ایسے مقام پر چھوڑا جائے جہاں قاری کا ذہن خود بہت سے نتائج اخذ کرے۔ ایسے افسانے قاری کو غور وفکر پر آمادہ کرتے ہیں۔ یہاں ضروری نہیں کہ ایک ہی قرأت میں قاری کی تشفی ہو جائے اسے متن کی دوسری، تیسری قرأت بھی کرنی پڑسکتی ہے۔ پانڈرچ اس تجربے کی عمدہ مثال ہے۔

کاروباری ذہنیت نے وضع داری، ہمدردی اور اپنائیت کی ہماری قدروں کو کچھ اس طرح تاراج کیا ہے کہ اب ہمیں اندازہ بھی نہیں کہ ہم کیسی نعمت سے محروم ہو گئے ہیں۔ علی محمد لون کا افسانہ پاپی پجاریوں کی سنتان ماضی اور حال کے واقعات کی بہ یک وقت سیر کراتے ہوئے ہمیں اس محرومی کی طرف متوجہ کرتا ہے۔ ماضی اور حال کی یہ سیر افسانے کی اس تکنیک کی یاد دلاتی ہے جسے شعور کی رو کا نام دیا گیا ہے۔ محض دو کرداروں کی باہمی گفتگو پر مشتمل اس افسانے کا پلاٹ اس قدر مربوط ہے کہ قاری کے ذہن پر افسانہ نگار کی گرفت مستقل رہتی ہے۔ اسے کرداروں کی کمی کا احساس ہوتا ہے نا مناظر کی۔ وہ تو ان کو ٹوٹتی بکھرتی قدروں کے نوحے میں خود کو شریک محسوس کرتا ہے جس کا بیان ان دو کرداروں کی زبانی ہو رہا ہے۔

بچوں کی پاکیزہ محبت کے پراثر بیان سے مملو حامدی کاشمیری کی کہانی نملی

انسانوں کے مابین رنگ، مذہب اور زبان کے امتیازات کی نفی کرتی ہے۔ انسان کو انسان سے محبت کرنے کا درس دیتی ہے۔ بچوں کی نفسیات کو موضوع بنا کر لکھے گئے افسانے ہمیشہ مقبول ہوتے ہیں۔ راجندر سنگھ بیدی کا افسانہ 'بھولا' ہمارے ذہن میں ہے۔ رابندرناتھ ٹیگور کے 'کابلی والا' کی منّی ہماری یادوں میں محفوظ ہے۔ کچھ ایسا ہی تاثر اس افسانے کا مرکزی کردار 'نملی' دلوں پر چھوڑ جاتی ہے۔ اس کے بولنے کا بچکانہ انداز دل کو چھو لیتا ہے۔

پہاڑوں کی سیر کو آنے والے بعض سیاح سادہ لوح پہاڑیوں کے بارے میں غلط رائے رکھتے ہیں۔ اور ان کی یہ غلط سوچ نیک طنیت پہاڑی باشندوں کے احساسات کو کسی طرح مجروح کرتی ہے، پشکر ناتھ کا افسانہ 'درد کا مارا' اسی تجربے کو بیان کرتا ہے۔ خدا نے پہاڑی باشندوں کو دستکاری کے عمدہ فن سے نوازا ہے۔ وہ اپنے فن میں ایسے طاق ہیں کہ ملک کے دیگر باشندوں کی رسائی اس فنکاری تک نہیں ہے۔ محنت، نفاست اور اعلیٰ معیار کی حامل دستکاری کی اشیاء کو ان کی اصل قیمت سے کم کر کے خریدنے کا رُجحان غیر پہاڑی باشندوں میں پایا جاتا ہے اور جب فنکار کو اس کے فن کے صحیح قیمت نہیں ملتی یا اسے جعل ساز اور دھوکے باز سمجھا جاتا ہے تو اس کا دل ٹکڑے ٹکڑے ہو جاتا ہے۔ اس عام تجربے کو مصنف نے خاص انداز میں بیان کیا ہے۔

غریبی، بے بسی اور لاچاری، انسان کا انسان کے ہاتھوں استحصال، آفاقی نوعیت کے ایسے مسائل ہیں جن کی مثالیں ہر عہد اور خطے میں نظر آتی ہیں۔ نور شاہ نے 'کہانی ایک علیا کی'، میں علیا نام کے ایک گھوڑے والے کی غریبی اور بے بسی کو موضوع بنایا ہے۔ کشمیر کی سیر کو جانے والے سیاح، جب بے رحم پہاڑوں کے بل کھائے پتلے پتلے پتھریلے راستوں پر قدم رکھنے سے ہچکچاتے ہیں تو انہیں گھوڑے والے کی مدد میسّر آ جاتی ہے۔ اور گھوڑے والے محض چند دھیلے پیسوں کے لئے اپنی جان پر کھیل کر گھوڑے کے ساتھ دوڑتے ہیں ان راستوں پر

دوڑتے ہیں جہاں چلنا یا یوں کہیئے چڑھنا جوئے شیر لانے سے کم نہیں۔ سخت جانفشانی کے باوجود اس غریب کو اپنے اور اپنے اہل خانہ کے لئے آسودگی کا کوئی لمحہ میسر نہیں آتا۔ ہمارے ترقی پسند مصنفین نے اس طبقے کے مسائل کی طرف توجہ تو کی لیکن اہل کشمیر کے مسائل اُن کی نظروں سے اوجھل ہی رہے۔ اس کے لئے ایک کشمیری مصنف کو ہی متوجہ ہونا پڑا۔

گونگے گلاب آٹھ برس کے ایک گونگے لڑکے کی دلدوز کہانی ہے۔ اس کے مناظر رونگٹے کھڑے کر دینے والے ہیں۔ عمر مجید نے مردوں کی بالادستی اور خواتین اور بچوں کے ساتھ ان کی بدسلوکی کا حقیقت پر مبنی بیان پیش کیا ہے۔ افسانے کے مرکزی کردار ساجد کی حرکتیں اس بات کی دلیل ہیں کہ عمر مجید ی بچوں کی نفسیات پوری طرح سمجھتے ہیں اور اسے پراثر انداز میں بیان کرنے کی قدرت بھی رکھتے ہیں۔ انسانی فطرت بالخصوص بچوں کی فطرت کی خاصہ ہے کہ جب کوئی بات ان کے دل کو لگ جاتی ہے اور وہ کسی ہدف کو پورا کرنے کا تہیہ کر لیتے ہیں تو پھر کوئی مشکل ان کے لئے معنی نہیں رکھتی۔ وہ اپنی جان کی پرواہ کیے بغیر اپنے ہدف کو پورا کرنے کی کوشش کرتے ہیں خواہ اس میں کامیابی ملے یا نہیں۔

وادیِ کشمیر ہندو اور مسلمانوں کے بیچ اتحاد و اتفاق کی علامت رہی ہے۔ خطّہ اپنے صوفی سنتوں کے لئے بھی مشہور ہے اور صوفیوں کا مذہب آدمیت کی تبلیغ اور احترام آدمیت ہے۔ ساتھ ہی فنونِ لطیفہ کو بھی یہاں خصوصی اہمیت حاصل رہی ہے۔ لالہ رُخ کشمیر کی ان تین خصوصیات کو ایک ہی ڈور میں پرو کر لکھی گئی کہانی ہے۔ جسے وریندر پٹواری نے خوبی سے نباہا ہے۔ افسانہ کی تکنیک اور زبان میں جدت پیدا کرنے کے لئے تجربے کئے گئے ہیں، تکنیک کی حد تک تو ٹھیک لیکن زبان اور بیان کا تجربہ غیر دلچسپ ہے۔

لال پُل کا دیوانہ ایک غریب ان پڑھ نوجوان کی عشق کی داستان ہے جسے اس پار کی کسی لڑکی سے محبت ہو جاتی ہے۔ لڑکی کی جانب سے مثبت ردعمل عاشق کو اور دیوانہ بنا دیتا

ہے۔نوجوان عاشق روز صبح محبوب کے دیدار کے لئے دریا پر نہانے چلا آتا ہے اور محبوبہ دریا کے اس پار کھڑے ہوکر اپنے عاشق کا حوصلہ بڑھاتی ہے۔ عاشق لال پل پار کر کے محبوب کے پاس پہنچتا ہے لیکن سیاست اپنا کام دکھاتی ہے اور دونوں کے ملن کی راہ میں رکاوٹیں حائل کرتی ہے۔ دیپک کنول کا یہ افسانہ محبت کی کہانی کے پردے میں کشمیر اور کشمیریوں کے ساتھ ہوئی زیادتی کو بیان کرتا ہے۔

وادی پچھلے دوڈھائی عشرے سے کچھ ایسے حالات سے نبرد آزما ہے کہ بھوک اور افلاس باشندگانِ کشمیر کا مقدر بن گئے ہیں۔ اپنی معمولی ضرورتوں کو پورا کرنے کے لئے حالات کا شکار یہ سادہ بندے سخت سے سخت آزمائش میں مبتلا ہو جانے کو تیار ہوتے ہیں۔ دو وقت کی روٹی انہیں اپنی جان خطرے میں ڈالنے اور دوسروں کی جان لینے کے ایسے کام پر آمادہ کردیتی ہے جو خود ان کے لئے سوہانِ روح ہے۔ ترنم ریاض نے 'برف گرنے والی ہے' میں وادی میں برپا تشدد کو ملنے والی افرادی کمک کو موضوع بنایا ہے اور ایک غریب خاندان کی لاچاری کو اجاگر کیا ہے۔ ترنم بے باک اور حقیقت پسند افسانہ نگار ہیں وہ بے خوف ہوکر اپنی بات کہتی ہیں۔ کہانی کا مرکزی کردار جاوید اس بات کی علامت ہے کہ وادی میں اس وقت تک تشدد پوری طرح ختم نہیں ہوسکتا جب تک افراد خود کو اپنی بنیادی ضروریات پورا کرنے سے محروم محسوس کریں گے۔ اصل وجہ کی طرف توجہ ضروری ہے۔

انسانی زندگی پر سماجی حالات کا گہرا اثر پڑتا ہے۔ کبھی یہ حالات دو انسانوں کو ایک دوسرے کے قریب لے آتے ہیں اور کبھی یہی حالات دوریوں کا سبب بن جاتے ہیں۔ دیپک بدکی کا افسانہ شیر اور بکرا دو انسانوں کے بیچ پیدا ہونے والی محبت کی کہانی ہے۔ محبت جو بڑھ کر زندگی بھر کے ساتھ میں تبدیل ہو جاتی ہے اور پھر ازدواجی زندگی کی تلخیاں دونوں کو ایک دوسرے سے دور کر دیتی ہیں لیکن دونوں کے دلوں میں ایک دوسرے کے لیے بے انتہا

پیار ہے۔ جس کا اظہار آخر میں اس طرح ہوتا ہے کہ سب حیرت زدہ رہ جاتے ہیں۔

آسائش اور آسودگی خواہ ہو یا نہ ہو لیکن، انسان کو اپنی بنیادی ضرورتیں پوری کرنے کا حق ہے۔ کرفیو انسانوں سے اُن کی آزادی چھین لیتا ہے۔ یہ ایک ایسی قید ہے جس کا شکار بیشتر وہی لوگ ہوتے ہیں جو بے قصور ہیں، معصوم ہیں۔ غلام نبی شاہد کا مختصر افسانہ 'آجادی' کشمیر کے اس سیاہ رُخ کی طرف ہمیں متوجہ کرتا ہے۔ کرنے والے اپنا کام کر کے چلے جاتے ہیں اور سزا معصوموں کو ملتی ہے۔

اہل کشمیر کے مصائب کی طرف متوجہ کرنے والے یہ افسانے اردو کا بیش بہا سرمایہ ہیں۔ ان میں افسانے کی تکنیک اور فن کے تعلق سے کئی تجربے کیے گئے ہیں۔ بیان میں تنوع پایا جاتا ہے۔ تاہم مجھے یہ کہنے میں باک نہیں کہ زبان کے اعتبار سے کئی افسانے نظرِ ثانی کے طلب گار ہیں۔ اکثر افسانوں کی زبان میں تکلف اور تصنع پایا جاتا ہے۔ زبان میں بے ساختگی کی کمی ہے۔ چھوٹی چھوٹی باتوں کے بیان کے لئے لفظوں کا طومار جمع کر دیا گیا ہے۔ بعض افسانے پڑھ کر جی چاہا کہ اُن کی زبان درست کر دی جائے یا غیر ضروری الفاظ حذف کر دیے جائیں لیکن شاید مرتب کا یہ مرتبہ نہیں۔ بہر حال افسانوں کا انتخاب آپ کے سامنے ہے۔

میں استاد محترم پروفیسر ایمرطس شعبہ اردو، دہلی یونیورسٹی پروفیسر عبدالحق صاحب کا ممنون ہوں کہ انہوں نے بطور تبریک چند سطریں مرحمت فرما کر حوصلہ افزائی کی۔ پروفیسر ابن کنول افسانہ نگار ہیں اور افسانے کے نامور نقاد بھی۔ انہوں نے اس انتخاب کے ضمن میں مفید مشورے دیے اور تقدیم لکھ کر کتاب کو زینت بخشی۔ اُن کا بھی شکریہ۔

-ڈاکٹر شمیم احمد

آج وہ کشمیر ہے محکوم و مجبور و فقیر
کل جسے اہلِ نظر کہتے تھے ایرانِ صغیر

کہہ رہا ہے داستاں بیدردیِ ایّام کی
کوہ کے دامن میں وہ غم خانۂ دہقانِ پیر

آہ یہ قومِ نجیب و چرب دست و تر دماغ
ہے کہاں روزِ مکافات اے خدائے دیرگیر

اقبال

ڈھول

پریم ناتھ پردیسی

پری محل کی مہیب صورت پہاڑیوں کے پیچھے سے صبح کا مسکراتا ہوا سورج دو نیزے اوپر آچکا تھا اور ابھی تک اسے اپنے پپوٹوں میں آنسوؤں کی نمی کا احساس ہورہا تھا۔

اُس کے قدموں کے آگے، ڈل کے کشادہ پاٹ سے پرے، بلیوارڈ کی حسین سڑک پر سبزی سے بھرے ہوئے چھکڑے شہر کی طرف دوڑ رہے تھے اور سڑک کے کنارے بنے ہوئے بنگلوں اور ہوٹلوں کے دروازوں پر ٹٹو والے گھوڑوں کی باگیں تھامے انتظار کر رہے تھے۔

اُس نے مٹی کا گھڑا پانی میں ڈبویا اور خود بھی کسی خیال میں ڈوب گئی۔ اپنی پھٹتی ہوئی جوانی سے جو تڑپ، جو سوز، جو اضطراب وہ کبھی کبھی ایسے موقعوں پر محسوس کیا کرتی تھی، آج اس کا کہیں نام ونشان نہ تھا۔ جیسے کارواں گذر چکا ہو اور شاہراہ پر صرف ڈھول رہ گئی ہو۔ اور سچ مچ یہ ڈھول اُسے ہر کہیں نظر آرہی تھی۔ اپنے بدن پر، اپنی آنکھوں میں ڈل کے ساکن جامد پانی پر، بلیوراڈ کے ہوٹلوں اور بنگلوں پر۔ اُڑتی ہوئی سی، چھائی ہوئی سی۔ اور وہ سوچ رہی تھی، اتنی ڈھول آج اچانک آئی کہاں سے؟ لیکن نہیں، یہ صرف اُس کے اورا کی وجود کی یاسیت تھی جس نے اُس پر غلبہ پایا تھا۔ ورنہ اتوار کی صبح کو بلیوارڈ اور گگری بل کے نزدیک ڈھول کہاں؟ وہاں تو موت کو فریب دے کر آئی ہوئی زندگی ہوتی ہے۔ زندگی کے متحرک سایے ہوتے ہیں اور سایوں کے قہقہے!

سڑک پر اب خاصی چہل پہل شروع ہوگئی تھی۔ ہوٹلوں میں ٹھہرے ہوئے

ہندوستانی صاحب لوگ صبح کی سیر سے واپس آرہے تھے۔ ہاتھوں میں البم اور کیمرے لئے ہوئے عورتیں اور بچے۔ سب خوش و شادمان، شاید وہ شنکراچاری کی پہاڑی سے اُترے تھے۔ اُن کے چہرے سندور کی طرح سرخ تھے اور بدن تانبے کی طرح سخت۔ انہیں دیکھ کر اسے اپنا بچپن یاد آگیا۔ جب وہ ڈل کے پار بلیوارڈ کے اُس طرف اپنی ماں کے ساتھ رہتی تھی۔ جھونپڑی اگرچہ چھوٹی تھی، مگر خوشیوں اور بے فکریوں سے بھری ہوئی۔ اُس وقت اُسے یہ معلوم ہی نہ تھا کہ ڈل کا یہ نیلا پانی جس کا بہاؤ بہتے ہوئے بھی محسوس نہیں ہوتا، اسے اس جھونپڑی سے کبھی جدا کرے گا۔ ان دنوں وہ ہر صبح اپنی سہیلیوں کے ساتھ ان پہاڑیوں پر چڑھتی اور سوکھی لکڑیوں کا ایک ٹوکرا بھر لاتی جو اس کے خیال کے مطابق بہت بڑی دولت تھی۔ لیکن اب ہر صبح کے ساتھ زندگی کے متحرک زاویے بدل چکے تھے۔ عمودی زاویے ٹیڑھے ہو چکے تھے اور بچپن کی بہت بڑی دولت اب حقیر نظر آرہی تھی بلکہ نفرت کی حد تک حقیر۔ عورت کے شباب کی دولت کچھ اور ہوتی۔ ایک بچہ جو اپنی کوکھ سے پیدا ہوا اور زندگی کی لو کو جلائے رکھے۔ لیکن وہ...... وہ اس دولت سے ابھی محروم تھی اور خاوند کے آئے دن کے طعنوں سے اُسے یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے زندگی کی لو بجھا چاہتی ہے اور اُس کے آگے مہیب تاریکی چھا رہی ہے۔ مہیب اور لرزہ خیز!

آج بھی خاندان نے اسے طعنہ دیا تھا۔ ہر چند وہ گذشتہ ایک ماہ سے بیمار تھا، مگر اپنی منکوحہ کو طعنے دینے کے لئے مرد کے پاس ہمیشہ بے حد قوت ہوتی ہے۔ اُسے شاید اپنی زندگی کی لو بجھتی ہوئی نظر آرہی تھی۔ جسے وہ دیکھنا نہ چاہتا تھا۔ لیکن اس میں بیوی کا کیا قصور تھا؟ کیا اس نے ہر موقع پر اپنا جسم اس کے حوالے نہیں کیا تھا؟ اس کی ہر طرح ناز برداری کی تھی۔ وہ یہی سوچ رہی تھی۔ اُس کی بچپن کی سہیلیوں کے گھر لڑکیوں اور لڑکوں سے بھرے ہوئے تھے۔ صرف وہ تھی جس کا گھر سونا سونا تھا۔ کیا ہر عورت کے بچہ ہونا ضروری ہے؟ کیا

زندگی کی لو بچے کے بغیر نہیں رہ سکتی؟ شاید نہیں رہتی ہو۔ اس کی سہیلیوں اور گاؤں کی بوڑھیوں کا یہی خیال تھا۔ بچہ خاوند اور بیوی کے درمیان وہ رشتہ ہے جو ازل اور ابد کو ملاتا ہے اور رشتہ دواؤں سے بھی حاصل کیا جاسکتا ہے۔ پچھواڑے میں جو نرس رہتی ہے وہ یہ دوائیں بیچتی ہے۔ پانچ روپے میں ایک پُڑیا یا ایک بچہ۔ جو زندگی کی لو کو جلائے رکھنے کا ضامن ہے۔ مگر یہ پانچ روپے کہاں تھے؟ ایک بے چارے مزدور کی بیوی پانچ روپے پس انداز نہیں کرسکتی۔ اپنے مرد سے مانگ بھی نہیں سکتی۔ وہ ہمیشہ ایسے اخراجات پر قہقہے لگاتے ہیں۔ جو چیز آٹھ برس کی ازدواجی زندگی کی دعائیں حاصل نہ کرسکی وہ پانچ روپے کی دوا کب کرسکتی ہے؟ لیکن اُسے مردوں کے اس فلسفے میں اعتقاد نہیں۔ اس نے ہر بار پچھواڑے کی نرس کے گرد حاجت مند عورتوں کا ایک ہجوم دیکھا ہے اور پانچ روپے کی بے شمار پڑیاں۔!

اُس نے کئی بار پس انداز کرنے کا مصمم ارادہ کیا اور جوں ہی تھیلی میں تین روپے سے زیادہ اکنّیاں اور دونّیاں جمع ہوتیں، یک لخت اُس کا خاوند بستر پر دراز ہو جاتا۔ دوادارُو کے لئے تھیلی بھی خالی ہو جاتی اور میر بحری کے مشہور سُود خور پنڈت سے بھی آٹھ دس رُوپے قرض پر لئے جاتے۔ ایسے موقعوں پر اُس نے کبھی تھیلی کو نہیں چھپایا۔ اور ہمیشہ اُس کا خاوند اکنّیوں اور دونّیوں سے بھری تھیلی دیکھ کر دل ہی دل میں اُس کی دور اندیشی اور پاک بازی کا معترف ہوتا۔ لیکن زبان پر کبھی بھی شکریے کا ایک آدھ لفظ تک نہ آنے دیتا۔ حالانکہ اُسے اپنے خاوند کی ناشکر گزاری کا کبھی احساس تک نہ تھا۔ جس کی دولت تھی اُسی کے کام آئی۔ پھر شکریہ کیا؟ اس بار بھی اُس نے چار سے زیادہ روپے جمع کئے تھے اور اب ہر لمحے اُسے زندگی کی لو کو حاصل کرنے کا یقین تیز تر ہوتا جاتا تھا۔ مگر زندگی نے پھر پلٹا کھایا اور خاندان بیمار پڑا۔ بیماری کے شروع شروع میں وہ بیوی کا پس انداز دیکھ کر اپنا آپ دبا دبا سا محسوس کرتا۔

لیکن جوں ہی سود خور کی باری آئی، احساس ختم ہو گیا۔ اور طعنوں پر اُتر آیا۔ کاش میرا بھی بچہ ہوتا جو شام کو آٹھ آنے کے پیسے کما لاتا! لیکن تم جیسی بانجھ عورتوں کے بچہ کہاں؟ خاوند کے اس زہریلے غصلے سے اُس کا لاشعور جھنجھنا اُٹھتا۔ جیسے کانچ کے ہزاروں برتن یک لخت گر گئے ہوں اور گرانے والا اپنی احتیاط پر حیران و پریشان ہو رہا ہو!

وہ یہی سوچ رہی تھی کہ پار سے ایک شکارا اُسے اپنی طرف آتا ہوا دکھائی دیا۔ جس میں ملاح کے علاوہ دو آدمی تھے۔ ایک خوش پوش اور دوسرا عام نوکروں کی طرح اُجلا اُجلا لباس پہنے ہوئے۔ خوش پوش شاید مالک تھا۔ اُس کے ہاتھ میں ایک کیمرہ تھا اور نوکر کے ہاتھ میں ایک ڈبہ...... وہ انہیں دیکھ کر بالکل حیران نہ ہوئی۔ ہر اتوار کو اس قسم کے خوش پوش انسان کئی شکاروں میں اُدھر گزرتے تھے اور گھاٹ پر کھیلتی ہوئی لڑکیوں کی تصاویر لیتے تھے یا پری محل کے اداس اور اُجڑے مناظر کی۔ اور وہ انہیں تصویر لیتے وقت دل ہی دل میں ہنستی، ان لڑکیوں میں کیا ہے؟ ننگی اور بھوکی لڑکیاں جن کی ساری تفریح گدلے پانی سے کھیلنا ہے۔ یہ تصویریں بھی ایسی ہی آتی ہونگی۔ میلی کچیلی، بدصورت اور ننگی۔ لیکن شاید وہ نہیں جانتی تھی کہ جنت ارضی کی میلی مخلوق کی تصویریں جہنم کے بے فکر باسی بے حد پسند کرتے ہیں!

شکارا نزدیک آرہا تھا اور وہ اُن کی باتیں سن سکتی تھی ''تصویر لینے دیگی'' نوکر پہلے خاموش رہا۔ جیسے اپنے آپ سے فیصلہ کر رہا ہو۔ پھر بولا۔ ''کیوں نہیں حضور۔'' وہ یہ سن کر چونک اُٹھی۔ کیا وہ اُس کی تصویر لیں گے؟ کیا انہوں نے بھی اُسے میلی کچیلی اور آوارہ سی لڑکی سمجھ رکھا ہے جو شکارے میں بیٹھے ہوئے ہر صاحب لوگ کو زور زور سے چلا کر ''سلام صاحب'' کہتی ہے۔ وہ جھک کر اپنے دونوں ہاتھوں سے گھڑے میں پانی بھرنے لگی اور نوکر نے نزدیک پہنچ کر کہا۔ ''مہتہ بی!''

اُس نے گردن اُٹھا کر لا اُبالیانہ انداز میں شکارے کی طرف دیکھا اور جلد جلد نظریں جھکالیں۔

نوکر نے مسکرا کر کہا۔ صاحب تمہاری تصویر لینا چاہتے ہیں۔"

اُس نے خاموشی سے گھڑا اٹھایا اور گھر کی طرف چل دی۔

مالک نے نوکر سے کہا۔ "تم نرے گدھے ہو۔ اپنی ذات کی ایک معمولی عورت تک کو نہ پھانس سکے جس کی تصویر سے ہم ہزاروں کما سکتے۔"

"ہزاروں؟ نوکر حیران ہو کر دل ہی دل میں سوچتا رہا اور پھٹی پھٹی نظروں سے اُسے جاتے دیکھنے لگا۔ واقعی وہ خوبصورت تھی اور ایسی عورتیں اُس نے میر بحری کے سارے علاقے میں نہ دیکھی تھیں۔

مالک نے کہا۔ "دیکھتے کیا ہو؟ جاؤ پیسہ دکھاؤ۔"

نوکر چھلانگ لگا کر کنارے پر آگیا اور اُس کے نزدیک پہنچ کر بولا۔ "مہتہ بی صاحب تمہیں پانچ روپے دیگا۔"

پانچ روپے کا نام سن کر وہ ٹھٹھک گئی۔ اُسے محسوس ہوا جیسے اس کی ٹانگوں میں سیسہ بھر دیا گیا ہو۔

پانچ روپے...... پانچ روپے

پچھواڑے کی نرس بھی پانچ روپے ہی مانگتی ہے۔

"بہ خدا اڈرو نہیں۔صرف ایک منٹ لگے گا۔اور پھر پانچ روپے۔"

اُس نے پھر بھی کوئی جواب نہ دیا۔اُسے محسوس ہوا جیسے ایک بچے اور اُس کے درمیان ہزاروں پردے حائل ہیں جو ایک ایک کر کے ہٹتے جارہے ہیں اور بچہ بازو پھیلائے اُس کی طرف آرہا ہے۔نوکر نے پھر کہا۔"میں بھی تمہارا ہی مسلمان بھائی ہوں۔ اگر مالک کی جیب سے پانچ روپے تمہارے لئے نکلیں تو کیا ہوا۔کم از کم آٹھ ترک شالی تو خرید سکوگی۔"

لیکن اسے شالی کی ضرورت نہ تھی۔اُسے پچھواڑے کی نرس کے لئے پانچ روپے چاہئیں۔

وہ آہستہ آہستہ گھاٹ کی طرف آگئی۔کندھے سے گھڑا اُتار کر ایک طرف رکھ دیا۔اور خاموش کھڑی رہی۔

آیئے صاحب!"نوکر نے مالک سے کہا۔مالک دل ہی دل میں خوش ہوا۔لیکن اس کا اظہار کرنا اُس نے ضروری نہ سمجھا تا کہ عورت اور نوکر کو احساس نہ ہو کہ اُن دونوں نے اس کیلئے کوئی بڑی قربانی دی ہے۔ اُس نے کیمرہ ٹھیک کیا۔ نوکر نے اُسے Pose سمجھا دیا۔دونوں ہاتھ آگے کو۔بدن ڈھیلا ڈھیلا۔ہونٹوں پر مسکراہٹ اور آنکھوں میں مصنوعی خمار۔وہ پار بلیوارڈ کی طرف دیکھنے لگی۔سڑک پر گہما گہمی شروع ہوگئی تھی اور دور کبوتر خان سے رنگ برنگی پردے لہراتی ہوئی ٹیکسیاں گھاٹوں کی طرف آرہی تھیں۔ایک ......دو......تین اور تصویر لی گئی!

آتی بار جو دھول اُسے ہر چیز پر چھائی ہوئی سی نظر آگئی تھی، واپسی پر وہ کہیں نہ

تھی۔ پری محل کے اُوپر مسکراتے ہوئے سورج کی کرنیں ہر چیز پر لوٹ کر قہقہے لگا رہی تھیں۔ بنگلے، ہوٹل، ڈل، گاؤں سب ان قہقہوں سے دور ہو رہے تھے۔ اُس کے پپوٹوں میں بھی اب نمی نہ تھی، اس کے برعکس اُسے اپنے آپ میں ایک لطیف قہقہے کی لذت محسوس ہو رہی تھی جو گدگداہٹ سے اُبھرتا ہے اور روکنے کے باوجود اُبھرتا ہی رہتا ہے۔ اچھا ہوا، آج تک آج تک اُسے بچہ نہیں ہوا۔ ورنہ سیاہ پیرہن کے تلے کچے انار کی طرح یہ سخت چھاتیاں کہاں ہوتیں۔ گورے چہرے کا تناؤ اور بازوؤں کا تناؤ کہاں ہوتا؟ وہ اُس ناشپاتی کی طرح دکھائی دیتی جس کا رس نچوڑا گیا ہو۔ گوشت اور پوشت کے نیچے صرف ہڈیوں کا پنجر رہ جاتا۔ اور زندگی کسی مفلس کی شرمیلی مسکراہٹ کی طرح نظر آتی۔

گھر پہنچ کر اُس نے خاوند سے کچھ بھی نہ کہا۔ ممکن ہے وہ اس حرکت کو ناپسند کرے۔ لیکن خاوند چُپ نہ رہ سکا۔ بولا۔۔۔ ''دیر کیوں ہوگئی؟''

''یوں ہی!'' اُس نے بے پروائی سے جواب دیا اور کندھے سے گھڑا اتار کر رکھ دیا۔ اس کے خاوند کو اس جواب سے تسلی نہ ہوئی۔ یوں ہی دیر کیسے ہوتی ہے! وہ سوچنے لگا۔ بڑی دیر تک وہ اسی تذبذب میں بھٹکا رہا۔ پھر بولا۔۔۔ ''یونہی کیسے؟'' بیوی نے دوبارہ بے پروائی سے جواب دیا۔۔ ''کچھ بھی نہیں۔ ایک صاحب تصویر لے رہے تھے۔''

''کس کی؟''

بیوی شاید اس سوال کی متوقع نہ تھی۔ وہ اندر ہی اندر لرزنے لگی اور اُس کا خاوند بڑی بے تابی سے جواب کا منتظر رہا۔ بالآخر اُس نے مٹی کی خالی ہانڈی کو بالکل غیرارادی طور پر ایک جگہ سے اُٹھا کر دوسری جگہ رکھتے ہوئے کہا۔۔ ''ایک عورت کی!''

اُس کا خاوند چونک اُٹھا جیسے جھونپڑی کی چھت اُس کے سر پر آ گری ہو۔ ''عورت کی؟ کون تھی وہ؟''

''مجھے کیا معلوم ۔۔۔؟ اُس نے اس انداز میں جواب دیا جیسے اُسے خود اُس عورت سے نفرت ہو۔۔

''اور تو تماشہ دیکھتی رہی۔۔'' اس بار اُس کے الفاظ میں طنز تھی۔ وہ اس سوال پر حیران رہ گئی۔ اُس نے اندار ہی اندر پیرہن کی جیب میں پڑے ہوئے نوٹ کو چھوا اور ہلکا سا اطمینان محسوس کیا۔ خاوند نے اپنا طنز نا کافی محسوس کرتے ہوئے کہا۔ '' آج کل کی عورتوں کا کیا ہے، جسم بھی کوئی کہے وہ بھی پیش کریں گی''۔

اُس کی آنکھیں پھیلنے لگیں۔ اُسے اپنے پاؤں تلے کی زمین سرکتی ہوئی سی دکھائی دی۔ وہ اضطراب میں بار بار مٹی کی ہانڈی کو ایک جگہ سے اٹھا کر دوسری جگہ رکھتی گئی۔ جیسے سارے کمرے میں اُس ہانڈی کو رکھنے کے لئے کہیں موزوں جگہ نہ ملتی تھی، جہاں وہ سہارے کے بغیر رہ سکے۔ اس نے اس دوران میں ایک بار بھی بستر پر پڑے خاوند کی طرف نہ دیکھا۔ اُسے محسوس ہونے لگا جیسے اُس کی پیشانی پر گھاٹ کی ساری کہانی لکھی جا چکی ہے اور وہ اُسے ایک ہی نظر سے پڑھ ڈالے گا۔

سود خور پنڈت نے کل ہی سات روپے دیئے تھے۔

اُس نے فیصلہ کیا کہ یہ پانچ روپے اُسی کو دوں گی۔ بوجھ تو ہلکا ہوگا۔ لیکن فوراً اُسے خاوند کا خیال آیا۔ شاید پوچھ بیٹھے یہ پانچ روپے کہاں سے آئے، جب وہ خالی تھیلی آج سے دس دن پہلے دیکھ چکا تھا۔

وہ سوچتی رہی۔ بالآخر خاوند کو کھانا کھلا کر وہ فیصلہ کیے بغیر ہی نرس کے پاس چلی گئی۔ اور جب واپس آئی تو بے حد خوش تھی۔ خاوند کے طعنوں کے تمام نقوش لاشعور سے مٹ گئے تھے۔ نرس نے اُسے دوا دی تھی اور بچے کا یقین دلایا تھا۔ اُس رات اُس کا بیمار خاوند اُس کی عجیب وغریب حرکتوں پر حیران رہا۔ ''یہ کیا بچپنا ہے؟'' اُس نے کئی بار پوچھا اور وہ ہر بار مسکراتی رہی اور دوسرے دن صبح اُسے سچ مچ اپنے پیٹ میں ایک زندہ بچے کا احساس ہوا۔ زندہ بچہ جو اُس کی زندگی کی لو کو بجھنے نہیں دے گا۔ جو ازل اور ابد کو ملائے گا۔ دوشیزگی سے کل رات تک جو تشنگی سی اُسے ہر وقت محسوس ہوتی تھی وہ آج بجھ گئی تھی۔ وہ اداسی اور تفکر، جو ہر صبح پڑوس کے بچوں کو روتے ہنستے دیکھ کر اس کے اندر ہی اندر ذہن کا احاطہ کیے رہتی تھی، اب مٹ چکی تھی۔ ایک موہوم سی اُمید نے اُس کی زندگی کے تاروں کو ملا کر اُن سے ہم آہنگ آواز پیدا کر دی تھی۔ اگر چہ وہ آواز ابھی اس قدر مدھم تھی کہ اُس کا بیمار شوہر نہ سن سکتا تھا۔ مگر وہ سن سکتی تھی۔ تاروں کا ارتعاش اور تعاش کی جھنجھناہٹ تک کو محسوس کر سکتی تھی۔ یہی ارتعاش اُس کی آرزو تھی جسے محسوس کرنے کے لئے وہ آٹھ سال سے بے تاب تھی۔ اب اسے سنبھالنے کے لئے بلند حوصلگی کی ضرورت تھی، ضبط کی ضرورت تھی۔ کاش اس نے کچھ عرصہ پیشتر یہ اقدام کیا ہوتا! لیکن کیمرے لئے ہوئے سیاح صرف ننگی اور بھوکی لڑکیوں کی تصویر لیتے تھے۔ اور وہ بھی بلا کسی معاوضے کے نہ لڑکیاں اس کے لئے احتجاج کرتی ہیں نہ تصویر کھینچنے والے اس کی ضرورت محسوس کرتے ہیں اور پری محل کے اُجاڑ کھنڈر بلیوارڈ سے پرے سب کچھ دیکھتے ہیں اور چپ رہتے ہیں۔ کل بھی ان کھنڈروں نے اُسے فوٹو گرافر کے سامنے کھڑا دیکھا اور نوٹ بھی دیا تھا۔ اور آج صبح وہ اُسے پھر دیکھ رہے ہیں جب وہ ایک محسوس بشاشت سے پھٹی پڑی ہوئی ہے۔ اور سب کو راز کی بات کہنا چاہتی ہے مگر کہہ نہیں سکتی۔

کچھ دنوں بعد اس کا خاوند ٹھیک ہو گیا۔ اور پھر وہی طعنے شروع ہو گئے اس سے پہلے یہ طعنے سُن کر اُس کا دل ملول ہو جاتا تھا اور اکثر آنکھوں میں آنسو پھوٹتے تھے۔ لیکن اب یہی طعنے اسے میٹھے سے لگنے لگے۔ اور وہ انہیں سُن کر ہر بار مسکرا دیتی۔ جیسے کہتی ہو۔ ''ان کی عمر زیادہ نہیں۔ یہ بوڑھے ہو گئے ہیں اور جلدی ہی مر جائیں گے۔ چند ہی مہینوں کی بات تو ہے جب یہی طعنے لوریوں میں تبدیل ہوں گے۔ وہ آج ہی سے ان کا اندازہ بھی لگا سکتی تھی۔ خاوند سر جھکائے ہوئے ہے۔ اُس کے چہرے پر شرمندگیاں ہیں اور اُس کے ذہن کو ان کی تلافی کے لئے موزوں الفاظ نہیں ملتے۔ وہ عالی ظرف عورت کی طرح اب بھی مسکرا رہی ہے۔ چبھتے ہوئے گذشتہ طعنوں کو بھلا رہی ہے بلکہ بھول چکی ہے۔ لیکن اُس کا خاوند ندامت میں غرق ہے اور بچہ ہنڈولے میں ایڑیاں رگڑ رگڑ کر باہر نکلنے کی کوشش کر رہا ہے۔ شاید کہہ رہا ہے۔ میں بھی ڈل کے نیلے پانی میں کھیلوں گا۔ میلی کچیلی اور بدصورت آوارہ لڑکیوں کے ساتھ سارا دن گھاٹ پر بیٹھا کروں گا اور سیاح میری تصویر لیا کریں گے۔ مگر وہ اُسے گھاٹ پر نہیں جانے دیگی۔ چہ جائیکہ پری محل کے اُجاڑ کھنڈر سب کچھ جانتے ہیں اور ہمیشہ سب کچھ جانتے رہیں گے۔

چار مہینے گذر چکے تھے۔

ایک شام اُس کا خاوند مزدوری سے واپس آیا اور اسے بلا کر پوچھا۔ ''تم اس عورت کو جانتی ہو جس کی تصویر کسی صاحب نے لی تھی؟''

وہ اندر ہی اندر سے کانپنے لگی۔ سر سے اشارہ کر کے بولی۔ ''نہیں!''

خاوند نے مسکرا کر دوبارہ پوچھا۔ ''جانتی ہو گی؟''

''کس عورت کو؟''

اس نے گھبرائی ہوئی آواز میں جواب دیا۔ ''ہر روز تو صاحب تصویر لیتے ہیں۔''

خاوند نے اسی انداز میں کہا۔ ''تمہیں نہیں یاد۔ آج کوئی چار مہینے گذرے جب تم ہی نے کہا تھا کہ کسی صاحب نے عورت کی تصویر لی۔''

اب کی بار اُس کے چہرے کا رنگ فق ہو گیا۔ پری محل کی مہیب پہاڑیوں کی غیر جذباتی چوٹیاں اُسے زمین پر گرتی ہوئی نظر آئیں اور ڈوبتے ہوئے سورج کی سنہری کرنیں کیچڑ میں لت پت دکھائی دیں۔ کیا پری محل کے کھنڈروں نے اُس کا راز افشا کر دیا تھا؟

وہ خاموش مگر حیران نظروں سے اُسے دیکھنے لگی جس کے چہرے کی مصنوعی مسکراہٹ آہستہ آہستہ غصے میں بدل رہی تھی۔ ''تو تم نہیں جانتی اُسے؟'' اُس نے ایسے انداز میں کہا جیسے وہ سب کچھ جانتا ہو۔ اور اب اُس کے منہ سے ہاں سننے کا منتظر ہے۔ اُس نے بھی اپنے دل میں سب کچھ کہہ ڈالنے کا قصد کیا۔ لیکن الفاظ کی قطار آتے آتے اس کے ہونٹوں پر بکھر گئی۔ صرف ایک ارتعاش پھیل گیا جسے اس کا خاوند نہ سمجھ سکا۔

یکایک اُس کے خاوند نے اندر کی جیب سے تصویر نکالی اور اُسے دکھاتے ہوئے بولا۔

''یہی ہے نا وہ۔ جسے تم شاید اب بھی نہیں جانتی۔؟''

تصویر دیکھتے ہی اُس کے منہ سے ہلکی سی چیخ نکلی۔ وہ آنکھیں پھاڑ کر فرش پر پڑی ہوئی تصویر کو دیکھنے لگی۔ سیاہ پیراہن میں لپٹا ہوا گورا گورا بدن، چہرے پر شہد آمیز مسکراہٹ

جیسے بادام کے پھول دونوں ہاتھ آگے کو جیسے کنول کے دو پھول جڑے ہوئے۔ وہ ایک نظر سے تصویر دیکھتی رہی اور دوسری نظر سے خاوند کے چہرے کا اتار چڑھاؤ۔ اُسے فوراً ہی محسوس ہوا جیسے تصویر میں پیراہن کے باوجود بھی وہ سر سے پاؤں تک ننگی ہے۔ اُس کی کچی انار جیسی چھاتیاں ننگی ہیں۔ پُر گداز بازو ننگے ہیں اور اُس کے سارے بدن پر بلیوارڈ کی دھول اڑ رہی ہے۔ خاوند نے زہر بجھے ہوئے لفظوں میں کہا۔ ''دیکھتی ہو۔ اب تو اسے پہچانتی ہوگی۔ سُنا ہے بازار میں خوب بک رہی ہے۔ لوگ اسے ولایت تک لے رہے ہیں۔ کتابوں میں چھاپ رہے ہیں۔ اخباروں میں نکال رہے ہیں اور کشمیر کی عورتیں اسے دیکھ کر پانی پانی ہو رہی ہیں۔ تم نے تصویر کیا کھنچوائی اپنی ماؤں اور بہنوں کی عزت بیچ ڈالی۔''

اُس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ وہ آنسو جو طعنے سن سن کر بھی اتنے تلخ نہ ہوتے تھے۔ آج کے آنسوؤں میں دھوئیں کی سی کڑواہٹ تھی۔ تیزاب کی سی جلن اور زہر کی سی تلخی۔ خاوند اُس کے آنسو دیکھ کر بھڑک اُٹھا۔ بولا۔ ''اب روتی کیا ہو۔ جو ہونا تھا، ہو چکا۔ اس صاحب نے تمہاری تصویر ہی نہ لی بلکہ تمہاری عصمت پر بھی تھوکا۔ تمہارے خاندان پر تھوکا۔ تمہاری نسائیت اور تمہاری زندگی پر تھوکا اور یہ تھوک ایسی ہے جو زندگی بھر تمہارے بدن سے الگ نہ ہوگی۔ اب جو چاہو کرو۔ کیا تعجب ہے جو کچھ تمہارے پیٹ میں ہے وہ بھی کسی صاحب کا......'' اُس کا چہرہ تمتما اُٹھا۔ آنکھوں کی پلکیں تیز تیز جھپکنے لگیں اور کچے انار جیسی چھاتیاں پھڑکنے لگیں۔ اُس کے دماغ میں ایسی حالت پیدا ہوگئی جیسے بارود کا بہت بڑا ڈھیر یک لخت چنگاری لگنے سے پھٹ گیا ہو۔ وہ بے ہوش ہو کر دھڑام سے گر پڑی۔ جب اُسے ہوش آیا۔ رات آدھی اُدھر تھی آدھی ادھر۔ کمرے میں تاریکی اور خاموشی بانہوں میں بانہیں ڈالے اونگھ رہی تھیں۔ وہ سوچنے لگی۔ آخر میں نے کیا کیا؟ کیا کیا؟ کیا مرد اپنی تصویریں نہیں کھنچواتے؟

اُس نے اپنا ہاتھ آہستہ سے اُبھرے ہوئے پیٹ پر پھیرا۔ اُسے شدت سے محسوس ہوا جیسے اُس کے پیٹ میں وہ بچہ نہیں جو اس کی زندگی کی لو کو جلائے رکھے گا بلکہ دھول ہے جو ہمیشہ ہمیشہ کے لئے اُس کے مستقبل پر چھائی رہی گی۔

☆☆☆

کاغذ کا واسدیو

پریم ناتھ در

جب دھوئیں کی لپیٹ میں مرگھٹ کے دیودار بھی آ گئے، واسدیو سے کہا گیا کہ چتا کو نمسکار کرے اور گھر کی طرف چلے۔ اس وقت واسدیو کے ہاتھ پاؤں اوروں کے اشاروں پر ہی چلتے تھے۔ خود تو وہ کہیں اور تھا، ہاتھ پاؤں سے دور، ایک ایسی دنیا میں جہاں بنیادیں ہل رہی تھیں، جہاں گھاٹیاں ہی گھاٹیاں تھیں۔ جہاں کروڑوں واسدیو گم ہو جائیں تو ان کا پتہ بھی نہ چلے۔ ایک دیوکی کے اُٹھ جانے سے اردگرد کے پہاڑ بھی گویا کھوکھلے ہو کر رہ گئے تھے۔ لیکن واسدیو ابھی گم نہیں ہوا تھا۔ اس نے اپنے دونوں بچوں کی آواز ارتھی کے پیچھے پیچھے آتی ہوئی سن لی تھی۔ ان کو جھاڑیوں کی اوٹ میں آگے آتے دیکھا تھا اور پھر جب ارتھی نالے تک آ گئی، اس نے دل میں فیصلہ بھی کیا تھا کہ بچے مرگھٹ تک نہیں جائیں گے، یہ وہ نہیں دیکھیں گے کہ ماں ان شعلوں میں گم ہو گئی، اور باپ کھڑا تماشہ دیکھتا رہا اور جب ارتھی نالے کے پار آ گئی تھی۔ اس نے نالے پر سے تختہ بھی اٹھا دیا تھا کہ اگر وہ دونوں نالے تک آ بھی گئے پھر بھی اُسی پار رہیں گے۔ واسدیو ان گھاٹیوں کو دیکھ رہا تھا۔ دھیرے دھیرے اور بچ بچ کر ہاتھ پاؤں ہلا رہا تھا۔ اس نے نمسکار کیا اور گھر کی طرف روانہ ہو گیا۔

ڈھال پر اترتے ہوئے اس کے پیر ڈگمگائے شاید اس لیے کہ اس کے سینے میں پہاڑ گھسنے لگے تھے یا اس لئے کہ وہاں سے دھان کے کھیت دکھائی دے رہے تھے۔ جن کے کنارے کاٹتا ہوا وہ نالہ گرتا، لپکتا اور بل کھاتا اسی کے بچوں کی طرف جا رہا تھا۔ اس پار اس کے بچے بھی شاید اسی دھوئیں کو دیکھ رہے تھے جو اب دیوداروں سے بھی اوپر چلا گیا تھا۔ کتنی پاس تھی وہ گھاٹیاں کتنی گہری، یہ دھواں بھی اُس کی آنکھوں میں گھسنے لگا۔ لیکن اس نے قدم

سنبھالے، آنکھیں کھولیں اور نالے کی اترائیوں کو دیکھ کر ان اونچائیوں کی طرف بھی نظریں اٹھائیں جہاں سے یہ پانی مچلتا ہوا چلا آ رہا تھا۔ اس نے اپنے کان بھی کھولے۔ پانی پتھر پہ گر کے ٹوٹ رہا تھا، لیکن ٹکراؤ میں اس نے ہنسیاں سنیں۔ ٹوٹے ہوئے پانی کو لہروں میں جاتے دیکھا، آگے بڑھتے دیکھا۔ یہ دیکھ کر اس کے پاؤں میں قوت سی آ گئی اور وہ بچوں کی طرف تیز تیز قدم اٹھاتا گیا۔

نالے پر تلسی اور موہن اس کے دو بچے سسکیاں بھر رہے تھے گھاٹیاں کیا وہاں خود واسدیو کا سینہ کھلنے لگا تھا۔ اندر اندر پہاڑوں کا بوجھ بھی پگھلنے لگا تھا۔ اس نے وہاں بھی اپنے آپ کو سنبھالا۔ پہاڑوں کو تو پگھلنے دیا اور نالہ جو سامنے تھا اسی کے قہقہے اٹھا لیے اور اتنے زور سے ہنسا کہ خود نالے کی آواز تک نہ سنائی دی۔ اتنے قہقہے، اتنے قہقہے جیسے وہ ہنستا ہوا نالہ اسی کے سینے سے نکلنے لگا ہو۔

پھر بات بات پر واسدیو کے قہقہے گونجنے لگے۔ بات بات ہنسی کی لہروں میں سموئی ہوئی نکلی۔ اُس کے قہقہوں سے وادی بھر گئی۔ گھاٹیاں بھر گئیں، پہاڑوں سے بھی قہقہوں کے جواب آنے لگے۔ کائنات ہنسنے لگی۔ بچے بھی ہنسنے لگے، اتنا کہ اُن کو مردوں کیا، زندوں تک کا نام لینے کی فرصت نہ ملی۔ دن بھر ہنستے ہنستے انہیں رات کو ہنسی کے سپنے آنے لگے۔ واسدیو اور وہ دو کاغذ، کمانی اور ڈور کی طرح ایک رنگیلے پتنگ میں جڑ گئے اور قہقہوں میں لہرانے لگے۔

وہ تینوں ہر وقت جڑے رہتے تھے۔ رات کو خاندانی لحاف میں، دن کو رسوئی میں، آنگن میں، کوٹھار میں یا دھان کے کھیتوں میں۔ لیکن جہاں بھی ہوتے کھیلتے۔ واسدیو سیدھی بات کرتے ہوئے ناک کو کچھ ایسا سکیڑتا، ہونٹوں کو کچھ ایسے ہلاتا، منھ پر ایسے زاویے بناتا کہ تلسی اور موہن لہروں میں ہی رہتے۔ ہنستے ہی رہتے۔ نت نئی بات ہوتی، نئی بات پر نئے قہقہے

نکلتے اور واسدیو تماشے پر تماشہ کرتا جاتا۔ کچھ اور نہیں تو بیٹھے بیٹھے پگڑی سر سے اتارتا اسی کو طرح طرح سے باندھنے لگتا۔ پھیلی ہوئی، چڑھتی ہوئی، بڑی ٹوکری سی جیسے نمبردار باندھتا تھا۔ گھٹی گھٹی، گول گول شنکھ سی، جیسے پنڈت جی باندھتے تھے، بٹی ہوئی رسی جیسے تھوں والی، پھٹکارتی ہوئی جیسے چوکیدار باندھتا تھا۔ وہ سبھا کی نقل کرتا جو ساہوکار کے سامنے تتلاتا تھا۔ اسی طرح کی پگڑی ماتھے تک لاتا، ہاتھ میں ساہوکار کی طرح نسوار دانی کو لیتا، پھر ساہوکار کی طرح ہاتھ ہلا ہلا کر اسے گالیاں دیتا۔ دوطرفہ کھیل میں واسدیو کی ایک آنکھ سبھا کی سی پھٹی پھٹی ہو جاتی اور دوسری ساہوکار کی طرح تیز تیز چلتی۔ کبھی تو وہ بھُٹے کی داڑھی منھ پر لگاتا۔ ٹوٹی ہوئی عینک ناک کی نوک پر رکھتا اور سر نیچے اور آنکھیں اوپر حسن حکیم کی طرح نبض دیکھنے لگتا۔ ہر مرض کی وہ ایک پڑیا باندھتا، اور جیسے ٹوٹے دانتوں میں منقیٰ، سپستان، بادیان، منقیٰ، سپستان، بادیان، کی رٹ لگاتا۔ تلسی کہتی "حکیم چاپ میلی آنکھ میں دلد ہے" وہ پڑیا اُٹھاتا اور کہتا۔ "منقیٰ سپستان، بادیان" موہن کہتا "تتیم تاب مولے پیل میں دلد ہے۔" وہ وہی پڑیا اٹھاتا۔ "منقیٰ، سپستان، بادیان۔" احمد چرسی سے لے کر پنڈت جی تک کوئی ایسا نہ تھا جس کی اس نے نقل نہ اتاری ہو، تلسی موہن کو ہنسانے کے لئے، پتنگ کو ہوا میں رکھنے کے لیے۔

واسدیو کو بھی زندگی بسر کرنی تھی، صبح شام کی جدوجہد اسے بھی کرنی تھی، وہ بھی پسینے بہاتا رہا۔ جینے کی محنتیں بچوں سے بھی کرواتا، لیکن ایسے جیسے وہ تینوں ہر دم کھیل کے میدان میں تھے۔ کھیت سے گزرتے وہ گیدڑوں کی آوازیں نکالتے، پہاڑ پر چڑھتے تو رام، لکشمن ہنومان کا کھیل کھیلتے۔ وہ دونوں واسدیو کے کندھوں پر سوار، واسدیو ہنومان کا منھ بنائے، ہنستے کھیلتے کھٹن منزلوں کو طے کرتے تھے۔ وہ ٹھنڈے پانیوں میں نہاتے، بطخوں کی طرح ڈبکیاں مارتے، پانی کی چٹکیوں پر بھی نہ روتے، بطخوں ہی کی طرح "کوئے کوئے" کرتے، تالیاں بجاتے، غل مچاتے اور تلخیوں کو پاس بھی نہ آنے دیتے۔

ہنسنے ہنسانے کے علاوہ واسدیوان کے لیے کھلونے بھی بناتا تھا۔ شہر اس گاؤں سے بہت دور تھا جس کے راستے میں بہت سی پہاڑیاں تھی۔ اتنی دور واسدیو کھلونے لینے کیسے جاتا؟ جاتا بھی تو شہری کھلونوں کے دام کہاں سے لاتا؟ وہ اپنے کھلونے آپ بناتا۔ نئے کھلونے جن میں جان ہوتی تھی، جن کا بچوں سے زیادہ رشتہ ہو جاتا بہ نسبت ان شہری کھلونوں کے جن کے دام بھی زیادہ ہوتے تھے۔ وہ چشمے پر لٹکتے ہوئے سیبوں پر چونا پوتتا اور دن میں ہی چاند تاروں کو چشمے میں تھرتھراتے دکھاتا۔ اخروٹ کے خول میں چاول کے چار دانے ڈالتا۔ اس کے اوپر کاغذ چپکاتا، گھوڑے کے ایک بال کے ساتھ ذراسی تیلی باندھ کر بال کو کاغذ میں پھنسا دیتا۔ بال کے دوسرے سرے کو ایک داتُن کے ساتھ باندھتا اور داتُن کو گھماتا۔ اخروٹ بولنے لگتا اور بچے گری کھا کر اخروٹ کا گانا بھی سن لیتے۔ وہ سیبوں، ناشپاتیوں کو کھوکھلا کر کے، بید کی سیخوں کو ٹیڑھا کر کے، گول گول کنکریوں کو ترتیب میں بٹھا کر بیدِ مشک کی ٹہنیاں کاٹ کاٹ کر من بھائے باغ لگا کے کھلونوں کی ایک انوکھی دنیا میں رہتے تھے۔

اس نے تو جیسے قسم کھا رکھی تھی کہ اسے ان بچوں میں خوشی ہی کا نہیں بلکہ خوش قسمتی کا بھی احساس پیدا کرنا ہے اور جب وہ کبھی کسی دوسرے کو ان کے مقابلے پر اتراتے دیکھتا۔ اُس کے تن بدن میں آگ لگ جاتی، وہ زمین کھودتا، پہاڑ پر چڑھتا، تلسی موہن کے لئے ہر وہ چیز پیدا کرتا کہ ان کا سر نمبردار کے لڑکے سے بھی اونچا رہے۔

نمبردار کا بھائی شہر میں کسی افسر کے ہاں نوکر تھا۔ بھتیجے کے لئے وہ ایک ولایتی گڑیا لے آیا۔ اُسی دم نمبردار کا بیٹا گڑیا نچاتا، اودھم مچاتا مغرور تلسی کو دکھانے آیا۔ تلسی اور موہن اس لمحے واسدیو کے پاس تھے۔ وہ وہیں آنگن میں کھڑا تھا۔ آنگن کی برف کو بیلچوں سے کاٹ کاٹ کر کانٹوں کی دیوار سے باہر پھینکتا جا رہا تھا۔ اس نے بھی وہیں سے گڑیا دیکھی اور

اس سے پہلے کہ وہ تلسی کے چہرے پر ایک سایہ دیکھتا، اس نے ایک نعرہ بلند کیا جیسے وہ اس وقت کیا کرتا تھا جب کام کرتے کرتے اسے کوئی نیا کھیل سوجھتا۔ تلسی اور موہن کی آنکھیں چمک اٹھیں۔ وہ تالیاں بجاتے ہوئے گڑیا والے کو وہیں چھوڑ کر برف پر لڑھکتے پھسلتے باپ کی طرف دوڑے چلے گئے۔ واسدیو نے دونوں کو اٹھا کر پیار کیا۔ ان کو مکان کے برآمدے میں بٹھا کر ایک کمبل سے لپیٹا۔ تلسی نے گڑیا والے کو بھی کمبل میں جگہ دی اور آنکھوں آنکھوں میں کہا کہ دیکھ میرا باپ کیا تماشا کرتا ہے اور جب واسدیو بھالو کی طرح چلنے لگا، جن پریوں کی طرح اچھلنے لگا۔ بیلچہ جادوگر کی طرح چلانے لگا اور برف کو کاٹ کاٹ کر کانٹوں کی دیوار کے اندر ہی ایک ڈھیر میں چڑھاتا گیا۔ گڑیا والے کی گڑیا بھی کمبل میں گھس گئی اور دھیرے دھیرے اس کے نیچے دب گئی ذرا سی دیر میں آنگن بھی صاف تھا اور بچے برف کے ایک چھ فٹ لمبے تمام گڈوں کے باپ سے باتیں کر رہے تھے جس کی بھنویں اور جس کے بال گھوڑے کی دم کے تھے، منہ تھا اور مونچھیں تھیں۔

گاؤں کے بہت سے بوڑھوں نے بھی شہر کو نہیں دیکھا تھا، بچے کیا دیکھتے۔ لیکن نمبردار کا بھائی اپنے بھتیجے کو شہر لے گیا اور واسدیو کو ایک بھاری خطرے کا اندیشہ ہوا کہ نمبردار کا بیٹا آ کے شہر کی باتیں کرے گا، تلسی موہن کی آنکھیں جھک جائیں گی اور یہ موقع وہ تھا کہ گہری سوچ کی ضرورت تھی۔ وہ گاؤں کی حد پر اُسی پہاڑی نالے پر سوچنے بیٹھا اور جب کوئی راستہ دکھائی نہ دیا وہ اسی نالے کو گہری نظر سے دیکھنے لگا جو تلسی، موہن اور واسدیو کی طرح اُچھلتا، کھیلتا اور دوڑتا تھا۔ تلسی نے اس کے قہقہے بھی سنے تھے۔ اس نے واسدیو سے کئی بار پوچھا تھا، کہ نالے کو کون ہنساتا ہے۔ واسدیو نے ہر بار اس سے کہا تھا کہ نالے کا بھی ایک باپ ہے۔ بہت دور، پہاڑوں کے اوپر، آسمان کے پاس۔ یہ نالہ اُسی کی گود میں سے نکل چلا آتا ہے، باپ اسے اتنا ہنسا کے بھیجتا ہے کہ وہ ہنستا ہی چلا جاتا ہے اور جب تلسی نے

یہ بھی پوچھا تھا کہ جاتا کہاں ہے اُسے سمندر کا بھی خیال آیا تھا لیکن سمندر کے تصور سے واسدیو کانپ اٹھا تھا، اس کے جمود اور خاموشی میں ہنسی نہیں تھی، نالہ نہیں تھا۔ اس لئے اس نے کہا تھا کہ نالہ ہنستا ہی جاتا ہے۔ کہیں بھی نہیں رکتا، رکے ہوئے پانی کا نام نالہ نہیں ہوتا۔

وہ نیلا چشمہ جس کی باتیں چرواہے کرتے تھے جہاں سے وہ نالہ نکلتا تھا۔ ڈیڑھ دن کی کٹھن چڑھائیوں کے اوپر تھا۔ جانے والے کو رات کھلے پہاڑ پر بسر کرنا پڑتی تھی۔ لیکن واسدیو نے عزم اور انتظام کرلیا۔ دو دن کی روٹیاں باندھیں اور دولوئیاں اٹھائیں اور تلسی موہن اس سے پہلے کہ نمبردار کا بیٹا شہر سے آتا، رام، لکشمن ہنومان کا کھیل کھیلتے، ہری ہری ان دیکھی وادیوں میں سے گزرتے، پہاڑ کی دھوپ ہواؤں میں، پہاڑوں سے اوپر، آسمان کے پاس، وہاں، جہاں نہ نمبردار کا بیٹا پہنچ سکتا تھا، نہ تحصیلدار کا، خود نالے کے باپ تک آگئے۔

نمبردار کے بیٹے کی آنکھوں میں شہر کی تمام روشنیاں بجھ گئیں، جب اس نے تلسی سے یہ سنا کہ اس نے اور موہن نے بھی نالے کے باپ کو تین پہاڑ اوپر ایک رنگے ہوئے چشمے میں دیکھا تھا۔ چشمے میں برف کے بڑے بڑے لٹھے تیرتے ہوئے دیکھے تھے جو حقیقت میں نیلے میاں کے بازو تھے۔ یہ کہ ابا نیلا تھا لیکن بیٹا نکلتے ہی بے رنگ پانی جیسے دکھائی دیتا تھا۔ مگر باپ کی گودی سے نکلتے ہی ہنسنے لگا تھا۔ انہوں نے وہ گدگدی بھی دیکھی تھی جو باپ اُسے کرتا تھا اور یہ کہ گاؤں سے لے کر چشمے تک انہوں نے نالے کے انگنت کھیل دیکھے تھے۔ کہیں سانپ کی طرح رینگتا تھا، کہیں شیر کی طرح جھپٹتا تھا کہیں چکّی چلاتا تھا کہیں فوراہ۔ اس کے کنارے پتھر پہ انہوں نے مخمل بچھی دیکھی تھی۔ ہری بھی اور لال بھی۔ یہ کہ راستے میں پریوں کے باغ تھے، جن میں وہ پھول تھے کہ کوئی زمین پر کیا اگا سکے۔ تلسی نے گھر کی گیتا کو کھولا اور نمبردار کے بیٹے نے ہر ورق میں دبا ہوا، سوکھا ہوا نیا پھول دیکھا۔

یہ پھول نہ گاؤں میں تھے نہ شہر میں، افسر کے باغ میں بھی نہ تھے، تلسی نے اسے یہ بھی کہا کہ اس نے راستے میں دھوپ اور ہوا کا بیاہ دیکھا۔ جب وہ دن بھر دھوپ اور ہوا میں رہے تھے اور انہیں نہ دھوپ لگی تھی نہ ہوا، دھوپ اور ہوا وہاں اتنی گھلی ملی تھی۔ تلسی اور موہن بادلوں سے بھی اوپر گئے تھے۔ ایک بار جب نیلے میاں کے اوپر نیلا آسمان تھا اور دھوپ تھی۔ کہیں بہت نیچے بادل آ گئے تھے اور دھان کے ننھے ننھے کھیت غائب ہو گئے تھے۔ اس وقت کسی پری نے ان کی خاطر بادلوں میں ایک بڑا سوراخ کر دیا تھا، ایک کھڑکی سی کھل گئی تھی۔ جس میں سے انہیں پھر سونے کے کھیت دکھائی دیئے تھے۔ وہ ایک جادو تھا، جب اوپر دھوپ تھی، نیچے دھوپ تھی اور بیچ میں بادل تھے۔

نمبردار کے بیٹے نے جا کر اپنے باپ سے کہا کہ تلسی، موہن اور واسدیو تینوں پریوں کے رشتہ دار ہیں اور باپ کی ایک بھی نہ سنی، جب اس نے یہ سمجھانا چاہا کہ وہ اس کے ماتحت انسان ہیں۔

اور واسدیو کھلونے بناتا گیا، تماشے کرتا گیا اور بچوں کو ہنساتا گیا۔ کبھی کبھی وہ تھک بھی جاتے اور اس کی طرف پیٹھ کر کے اپنے کھلونوں میں محو ہو جاتے، گو ایسے لمحے بہت کم ہوتے جب واسدیو انہیں کھلونوں میں ہی محو ہونے دیتا۔ جب گھاٹیاں کھلنے لگتیں۔ اندر اندر نالہ بھی ڈوبنے لگتا، پتنگ کی ڈور کمانی ڈھیلی پڑتی اور کاغذ کا واسدیو گر پڑتا۔ ایسے لمحوں کو وہ آنے ہی نہ دیتا۔

ہنستے ہنساتے گاؤں میں دوسری سردیاں بھی آ گئی اور وہ بڑا دن بھی آ گیا۔ جب رات کو پہلی برف دبے پاؤں آ گئی۔ جب چپکے چپکے برف کے ڈھیر لگ گئے۔ چپہ چپہ سفید ہو گیا اور گرم لحافوں میں سوتے ہوئے دیہاتیوں کو خبر تک نہ ہوئی۔ ان کو برف کے سپنے تک نہ آئے، گاؤں میں روایت تھی کہ جو برف کو پہلے دیکھتا اور اس کا اعلان کرتا وہ برف کی بازی

جیتتا تھا۔ گاؤں والے اس کے سامنے ہار مان لیتے۔ سال بھر اس کی جیت زندہ رہتی، جب تک زمین کروٹ نہ بدلتی۔ ایک نئی برف کو لے آتی اور اتفاق کہیے یا قسمت کسی دوسرے کا ساتھ نہ دیتی۔ لیکن واسدیو نہ تو قسمت کو دیکھتا تھا نہ اتفاق کو۔ ایسے موقع پر وہ ہوا کو دیکھتا تھا۔ کئی دن سے انتظار میں تھا۔ دن چڑھے تک کیسے ہوتا؟ اس نے کھڑکی کھولی اور دیکھا۔ دوسرا کوئی ہوتا تو دیکھتے ہی چلا اٹھتا لیکن واسدیو اکیلا کیسے چلاتا۔ اس نے تلسی اور موہن کو لحاف میں سے نکالا، ان کی آنکھوں پر برف رکھ دی۔ ان کو جگایا اور برف کا تماشہ دکھایا۔ پھر کھڑکی کے پاس تینوں نے مل کر برف کے نعرے بلند کیے۔ (دو پی پی اور ایک پھٹا ہوا بانس سا)۔ ایک دم جیسے سمٹے ہوئے گاؤں کے ٹکڑے ہو گئے، جیسے خاموش برف میں گرج آ گئی۔ گاؤں بھر گھبرا اٹھا اور ایک ایک فرد بند مکانوں، لحافوں اور اندر کی گرمیوں کو کوستا اٹھا۔ انہوں نے کھڑکیاں کھولیں اور دیکھا۔ لیکن ان کی آوازیں کیسے نکلتیں؟ انہیں یقین تھا کہ واسدیو کی آواز میں جو پہاڑ تک چھا گئی ہے ان کی اپنی آوازیں ایسے کھو جائیں گی جیسے برف کی ان جالیوں میں بارش کا ایک قطرہ کھو جاتا ہے۔ یوں تو ہر دل واسدیو کے ساتھ بول رہا تھا۔

"شینہ پتیو پتیو   مامہ یتیو یتیو"

یہ تو تھا اس دن کا آغاز، یہی ایک دھڑکن نہیں تھی جو یہ برف گاؤں میں لے آئی۔ دیکھتے دیکھتے پھوس کی چھتوں پر بھوت کھڑے ہو گئے۔ عالم گیر سفیدی کے پس منظر میں چیتھڑوں میں لپٹے لپٹائے کسان بیلچے لئے بھوت سے دکھائی دے رہے تھے۔ ایک ایک بیلچہ، ایک ایک ہاتھ میں من من برف گرانے لگا اور ایک ایک دھڑام پر بچوں کے نعرے بلند ہوئے۔ کہیں بلی پھاندی پھنس گئی، کہیں کتا دوڑا دھنس گیا، کہیں ٹہنی ہلی، برف کی چادر گری اور کسی کے سر پر آ گئی، کوئی لڑھکا، کوئی پھسلا جس نے دیکھا اُسی کے قہقہے نہ رکے۔

واسدیو بھی اپنی چھت پر کھڑا تھا۔ وہ بھی برف کے بیلچے چلا رہا تھا۔ لیکن واسدیو کا

بیلچہ عام زاویوں میں کیسے اٹھتا؟ وہ بیلچہ برف کو کاٹ بھی رہا تھا اور برف کے ساتھ مذاق بھی کر رہا تھا۔ وہ کاٹنا بھی کیا تھا۔ اس میں گدگدی سی کرتا اور آگے دھکیلتا۔ برف اس کے بیلچے سے کبھی گیند کی طرح اچھلتی تھی، کبھی فوارے کی طرح ابلتی تھی۔ ہر بیلچے کے ساتھ واسدیو ایک نئے جانور کی بولی بولتا تھا۔ ایسے موقعہ پر تلسی اور موہن واسدیو سے دور کیوں ہوتے؟ وہ دوسرے بچوں کی طرح نچلی کھڑکیوں پر کیوں ہوتے؟ واسدیو پھر چھت ہی کو کیوں صاف کرتا؟ اس کے دونوں بچے اس کے قریب ہی چھت کی آڑی کھڑکی میں کھڑے چلاّ رہے تھے، تالیاں بجا رہے تھے۔

لیکن اس دن واسدیو کی طاقت نے اس کا ساتھ نہیں دیا۔ اس کا بیلچہ کانپنے لگا اور اس کے پاؤں دکھنے لگے اور جب اسے یقین ہو گیا کی اس کا جوڑ جوڑ ٹوٹ رہا ہے۔ اس نے جلدی جلدی بیلچے چلائے۔ برف میں بڑے بڑے گھاؤ کئے اور بڑے بڑے مستطیلوں کو نیچے دھکیلا۔ ''کررر کررر دھپ۔ کرر کرر دھپ'' جیسے برف ترنگ کی ایک تیز تال بجائی جا رہی تھی اور جب اس کا درد بڑھتا ہی گیا۔ اس کا بیلچہ جلدی کے جنون میں چاروں طرف چلنے لگا اور برف ہر طرف اچھلنے لگی۔ جیسے تلسی اور موہن کی خاطر واسدیو اب برف کی ایک آندھی چلانے لگا تھا۔ وہ ان کو یہ کیسے سمجھاتا کہ شدید بخار آ گیا ہے اور اس کی ٹانگیں برف میں جواب دے رہی ہیں لیکن وہ ان کا ایسا بڑا دن کیسے بگاڑتا؟ کانپتا، ہلتا، تماشے کرتا، بچوں کو لے کر وہ آنگن میں اتر آیا جہاں چھت اور آنگن کی برف کا ایک بے ہنگم اور بدنما ٹیلا مکان کی دوسری منزل تک چڑھا ہوا تھا اس نے دیکھا کہ برف کا برا حال ہو گیا ہے۔ برف جس کی ہموار اور شفاف تہوں کو قدرت نے گالے پر گالا چن کے چڑھایا تھا۔ برف کا یہ حال دیکھ کر اسے ایسا محسوس ہو گیا کہ اس کی ہڈیاں بھی اپنی جگہ سے اکھڑ کر اس کے گوشت میں ایک جگہ ڈھیر ہو گئی ہے۔ لیکن برف کے اس میلے ڈھیر میں بھی کھیل تھے۔ اس نے تلسی اور موہن کی خاطر اس

ڈھیر پر کئی اور بیلچے چلائے اور انہیں ایک سیڑھی کی شکل میں ڈھال دیا اور جب بچے برف پر چڑھنے، اترنے اور باہر سے دوسری منزل کی کھڑکی میں کودنے، اچھلنے، پھسلنے میں مصروف ہو گئے، واسدیو موقع پا کر گرم زندگی کی جستجو میں چولہے کی طرف دوڑا۔ اس نے دو کانگڑیاں بھر دیں۔ جسم کی رہی سہی گرمی کو ایک موٹی لوئی سے باندھ دیا۔ اس کی بتیسی بھی بجنے لگی۔ اور اس کی ہڈی ہڈی کا درد بولنے لگا۔ لیکن اس نے چیخوں کو ایک بھنبھناہٹ میں دبایا جس کو سن کر تلسی اور موہن اندر دوڑے آئے اور کالی لوئی میں موٹے بھنورے کو دیکھ کر ہنسی سے لوٹ پوٹ ہونے لگے۔ تلسی اور موہن کو ہنستے دیکھ کر واسدیو کی سانس ایک لمحے کے لئے رک گئی۔ پھر اس نے بھنبھناہٹ کو اور تیز کیا اپنے دانتوں کو رہا کر کے خوب بجایا۔ اور تلسی موہن کو اور ہنسایا۔ لیکن کئی آہنی ہاتھ اس کی ہڈیوں کو ڈھونڈ رہے تھے، اس کی رگ رگ میں چیخ پکار تھی، اپنے بچوں کی ہنسیوں اور اپنی بھینچی ہوئی چیخوں کے درمیان اس نے پہلی بار ایک خلیج دیکھی۔ ڈور کمانی کو کاغذ بغیر لہراتے دیکھا۔ پہلی بار اس نے چاہا کہ وہ اکیلے رہے، چیخے روئے اور وہ ہنستے ہوئے دونوں آنگن میں چلے جائیں۔ جہاں پڑوسی کے اور بچے جمع ہو گئے تھے، تلسی اور موہن کو للکار رہے تھے۔ برف کی جنگ کھیلنے آئے تھے۔ لیکن تلسی کو برف کے گولے کون بنا کے دیتا۔ دوسرے بچے اس سے بڑے تھے، وہ خود برف تیز تیز اٹھا سکتے اور گولے بنا سکتے تھے۔ واسدیو نے دیکھا کہ دردوں کے پیچھے واسدیو ابھی جی رہا ہے اور تلسی کو اس کی سخت ضرورت ہے۔ اس کے تہہ خانوں سے ایک ابال اٹھا، جس نے اس کی ہڈی ہڈی کو لپیٹا اور وہ اٹھا۔ اس نے ایک جھٹکے میں اپنے آپ کو کانگڑیوں سے الگ کیا۔ لوئی اتار دی اور آنگن میں تلسی کا مورچہ لگا دیا۔ تلسی دھڑا دھڑ گولے برسانے لگی۔ واسدیو کی ایک ایک ہڈی ٹوٹنے لگی۔ گولہ اور ہڈی، ہڈی اور گولہ واسدیو گولے بناتا گیا اور چلاّتا گیا۔ ''وہ مارا، یہ مارا، مارا، مارا'' واسدیو جی بھر کے چلاّیا اور تلسی نے جی بھر کے گولے برسائے۔

پھر اس برفوں کے گرم دن پر بھی رات چھا گئی۔ تلسی موہن اور واسدیو خاندانی لحاف میں گھس گئے۔ واسدیو نے ان دونوں کو گرمی کی تلاش میں بھینچ لیا۔ اس کی سنگین ہمت جواب دے رہی تھی۔ درد سے زیادہ شدت کا اسے ڈر تھا کہ کہیں اس کی چیخ نہ نکل جائے اور تلسی موہن گھبرا نہ جائیں۔ ''کاکا کہانی''، تلسی نے اس کے سینے پر سر رکھا اور فرمائش کی۔ لیکن اس رات کی کہانی گم ہو چکی تھی۔ واسدیو کی زبان بس ''ہائے'' کر سکتی تھی اور چونکہ اس کی زبان اور اس کے ہونٹ مدت سے ٹیڑھے ہلتے رہے تھے۔ اس وقت بھی اس کی ہائے عجیب عجیب سروں میں نکلتی چلی۔ وہ ہائے کرتا اور اس کا منہ کبھی سُرنائے بنتا، کبھی پی پی۔ ٹمٹماتے دیئے کی روشنی میں اس کی صورت، اس کی آواز سے بھی عجیب دکھائی دیتی تھی، تلسی اور موہن سر اٹھا اٹھا کر ہنستے گئے۔ وہ ہائے پر ہائے کرتا گیا اور بچے ہنستے گئے۔ اس کا عضو عضو ٹوٹتا گیا حتیٰ کہ اس کے ہنسانے کے ارادے ٹوٹ گئے۔ پھر اس کی سُرنائے اور پی پی ٹوٹ گئی۔ اس نے ہڈیوں پر موت کو رینگتے ہوئے محسوس کیا۔ وہ کراہنے لگا۔ رونے لگا اور تلسی موہن دونوں ہنستے ہی گئے۔ اس رات کی طرح وہ کبھی ہنسے نہ تھے، واسدیو کا ناٹک بھی تو اس دن اتنا اچھا تھا۔ وہ ہنستے گئے۔ ہنستے گئے اور جب واسدیو کی آنکھیں دیئے کو بھی نہ دیکھ سکیں اور اس نے لاکھ کوشش کی کہ وہ سنجیدہ سروں میں انہیں بتا دے کہ یہ سب کچھ سچ ہے اس کی زبان نے اس کا پورا ساتھ نہ دیا۔ وہ کوشش کرتا رہا اور ان کی ہنسی تیز ہوتی گئی۔

واسدیو کا گلا بیٹھ گیا اور اس کی آنکھیں چوڑی ہوتی گئیں۔ شاید وہ اسی دیئے کو کھوج رہا تھا۔ شاید اُس اندھی ہنسی سے ڈر گیا تھا...... اس ڈرے ہوئے کو اگر تلسی اور موہن اس وقت دیکھ لیتے شاید وہ بھی ڈر جاتے لیکن انہیں بھی نیند آ گئی اور انہیں اس بھیانک ماحول سے اٹھا لے گئی۔

دوسری صبح تلسی کی آنکھ بہت دیر میں کھلی۔ کاکا لحاف میں نہیں تھا۔ اس نے سوچا

کہ چشمے پر سموار دھونے گیا ہوگا۔ پھر موہن بھی جاگ اٹھا اور دونوں لحاف میں چور کوتوال کھیلتے ہوئے لحاف سے باہر واسدیو کی لاش سے ٹکرائے۔ چشمے پر کاکا کہاں گیا تھا۔ وہ تو وہیں پڑا ہوا تھا۔ دونوں بے تحاشا ہنسنے لگے تھے۔ اس کے سینے پر چڑھے، انہوں نے اس کے منہ کو ہلایا، اس کا نیا رنگ، منہ کے نئے گراؤ، ایک نئے جانور کے جیسے تھے، ہنسیوں کی نئی اکساہٹ کے سامنے کیسے نہ ہنستے، وہ ہنستے ہی گئے جب تک کہ موہن کی ہنسی بھوک کے مارے رونے میں تبدیل ہوئی اور تلسی نے بھی ہنسی روک کر واسدیو کو کھیل ملتوی کرنے کو کہا۔ لیکن جب واسدیو نے اپنے چہرے کے زاویئے درست نہیں کیے، باتوں کا جواب نہیں دیا تو تلسی بھی روٹھ گئی۔ وہ بھی رونے لگی "کاکا ہمیں بھوک لگ رہی ہے۔ کانگڑی کی آگ بجھ گئی ہے۔" لیکن واسدیو ناٹک میں ہی پڑا رہا۔ ذرا بھی نہ ہلا۔ اس غیر معمولی ضد پر تلسی کے ننھے دل میں بھی حیرت پیدا ہوگئی۔ اس کی آنکھیں معمول سے زیادہ کھل گئیں اور وہ ڈرنے لگی۔

"نہیں نہیں کاکا۔ یہ کھیل ٹھیک نہیں۔ تم امّاں مت بنو کاکا۔ امّاں مت بنو۔ اماں والا کھیل اچھا نہیں۔ مجھے ڈر لگتا ہے کاکا۔ امّاں مت بنو کاکا......"۔

پونڈرچ

اختر محی الدین

''پونڈرچ''--!

ایک فلک شگاف نعرہ سنائی دیا۔اور ہائی اسٹریٹ کی اونچی اور بجلی کے قمقموں سے جگمگ کرتی ہوئی عمارتیں گونج اٹھیں۔

سیف بند کردو۔منیم۔سیٹھ نے آواز سنتے ہی منیم سے کہا اور خود دکان کی اندر والی کوٹھری کی طرف لپکا۔منیم نے جلدی سے سیف بند کیا۔چابیاں نکال کر ایک طرف رکھ دیں۔اور خود کھاتہ لے کر اس پر جھکا اور دو چار کا ورد کرنے میں ہمہ تن مصروف ہوگیا۔

''پونڈرچ......!''ایک دفعہ اور قریب سے اور زور سے آواز آئی۔اور منیم جیسے ہڑ بڑا اٹھا۔وہ ایک آنکھ سے بازار کی طرف اور ایک سے کھاتے کی طرف پریشانی کی حالت میں دیکھنے لگا اس کے چہرے پر عجیب عجیب سے نقوش دکھائی دیئے۔جو اگر ایک جگہ ملائے جائیں تو ایک بہت بڑا سوالیہ نشان بن سکتا ہے شاید وہ سوچ رہا تھا......''اب کیا کیا جائے''؟ کہ اتنے ہی میں ایک چوڑا چکلا جوان چیتھڑوں میں ملبوس اور منہ پر راکھ ملے ہاتھ بڑھاتا ہوا دکان کی طرف آیا

''سیٹھ نہیں ہیں''منیم نے کچھ اپنے آپ سے اور کچھ اس سے کہا۔اس کا چہرہ زرد پڑ گیا اور آنکھیں کھاتے پر جمی رہیں۔جیسے اگر وہ آنکھ اٹھا کر دیکھے تو شاید کہہ اٹھے......سیٹھ اندر والی کوٹھری میں ہیں مہاراج......اور مجھے سیف بند کرنے کا حکم دیا ہے۔''لیکن بھکاری جواب سنتے ہی کندھوں کو جھٹکا دے کر آگے بڑھا اور ایک بار اور زور سے پکارا......
''پونڈرچ''!

پونڈ رچ کے معنی کیا ہے...... کسے معلوم؟ لیکن یہ لفظ آٹھ سال سے ہائی اسٹریٹ میں گونج رہا ہے۔ کسی کو بھی اس کے معنی معلوم نہیں۔ پھر بھی ہر ایک کی زبان پر ''پونڈ رچ...... پونڈ رچ'' ہے۔ اور اس بھکاری کا نام ہی اب پونڈ رچ رکھ دیا گیا ہے۔ کیونکہ اس کا نام ولدیت، سکونت اور مذہب کسی کو بھی معلوم نہیں۔ جب وہ پہلے پہل یہاں دیکھا گیا (یہ آٹھ سال پیشتر کی بات ہے۔) تو کسی نے کہا تھا، پونڈ رچ کسی گاؤں کے ایک غریب چوکیدار کا اکلوتا بیٹا ہے۔ بچپن میں تنہائی میں رہنے کا عادی تھا۔ اور پندرہ سال کی عمر میں ایک نزدیکی جنگل میں جا کر ایک بہت بڑے پیڑ کے نیچے اللہ کو یاد کیا کرتا تھا۔ تین سال کی ریاضت کے بعد کئی دن غائب رہا اور آخر اس بازار میں دیکھا گیا۔ یہ سنتے ہی لوگوں نے اس کی پرستش کرنا شروع کی تھی۔ مسلمانوں نے اس کے ساتھ اللہ کی برکت وابستہ کی۔ اور ہندوؤں نے اسے بہت بڑا سدھ تصور کیا۔ جس کسی کی دکان پر پونڈ رچ گیا اور دکان پر چڑھتے ہی ایک نعرہ لگایا۔ دکاندار کی باچھیں کھل اٹھیں جیسے دنیا کی ساری دولت اور برکت اسی کے حصے میں آئی۔ (دکاندار اس کی خوش قسمتی پر رشک کرتے تھے) سیف کی چابیاں پونڈ رچ کے قدموں پر گریں۔ مختلف قسم کی مٹھائیاں آئیں اور شربت سکنجبین پیش کیے گئے اور اگر پونڈ رچ نے کچھ جھوٹا رکھ چھوڑا تو اسے تبرک سمجھ کر بیوی بیٹے اور رشتہ داروں میں تقسیم کیا گیا۔ بڑے بڑے سیٹھ پاؤں دبانے بیٹھے اور اگر کبھی پونڈ رچ نے چہرے کی راکھ ایک انگلی پر مل کر کسی کے ماتھے پر ٹیکا لگا دیا تو دوسرے دن اس کے گھر میں شکرانے کی دعوتیں پکیں۔ غریب غربا کو خوب کھلایا پلایا...... ضروری نہیں تھا کہ پونڈ رچ ہندو ہی کو راکھ کا ٹیکہ لگائے۔ اگر مسلمان کو بھی لگایا تو وہ بھی اپنے میں وہی شان، قوتِ ایمان اور خوشنودیِ رحمان محسوس کرتا تھا۔

یہ تھی پونڈ رچ کی حقیقت۔ ہائی اسٹریٹ کے بازار میں آٹھ سال تک اس ایک

مہمل لفظ کے علاوہ کبھی کوئی بات پونڈرچ نے نہیں کی۔ لوگوں نے لاکھ جتن کیے، لیکن یہ اللہ کا پیارا ''پونڈرچ'' کے سوا کبھی اور کچھ نہ کہہ سکا اور اس کی اس خاموشی میں بھی کوئی نکتہ ڈھونڈ نکالا جاتا تھا۔ درحقیقت پونڈرچ کو کبھی بات کرنے کی ضرورت محسوس نہ ہوئی۔ وہ جو کچھ چاہتا تھا خود اس کے سامنے پیش ہوتا تھا۔ ضرورت اگر تھی تو صرف اس بات کی کہ وہ کسی کے ہاں جائے جب تک وہ چاہتا تھا بہترین جگہ پر بیٹھتا اور جب جی چاہتا وہاں سے اٹھ کر سڑک کے عین بیچ میں لیٹ جاتا۔ ٹریفک رک جائے۔ کاروبار بند ہو جائے لیکن پولیس والے کی کیا جرأت کہ بات کرے، اسی وقت ایجی ٹیشن ہو جائے اور حکومت کے خلاف بڑے بڑے نعرے لگائے جائیں کیونکہ...... پونڈرچ درویش بیچ سڑک کے آسمان کی طرف آنکھ اٹھائے اللہ سے باتیں کر رہا تھا کہ پولیس والے نے آ کر ٹوکا اور نازل ہوتی ہوئی رحمت واپس چلی گئی۔

جب وہ پہلے ہائی اسٹریٹ میں آیا تھا اس کی عمر اٹھارہ برس کی تھی۔ بھیگی مسیں، سڈول جسم اور رس دار سرخ سرخ ہونٹ...... اللہ رے تیری شان یہ جوانی؟...... اگر اس کی مخمور آنکھ کی ایک ترچھی نظر سے بوڑھی سیٹھانی کی چہیتی بہو کو بچہ نہ ہو جائے تو شیطان سچا۔ بچے والیوں کو دودھ کی کمی محسوس ہوئی۔ اور اُس نے راکھ کی ایک چٹکی چھاتی پر مل کر دودھ کے فوارے پیدا کیے۔ ان آٹھ سالوں میں پونڈرچ نے ہزاروں کرامات کیں۔ اس کا فیض عام تھا۔ خواہ امیر، خواہ غریب۔ ہندو ہو یا مسلمان۔ کسی کو پونڈرچ کی بارگاہ میں آنے سے انکار نہیں لیکن اب......!

آج تین دن سے نہ معلوم لوگوں کو کیا ہو گیا۔ وہ اللہ سے بھی نہیں ڈرتے۔ یہ کلجگ ہے۔ کلجگ نہیں تو اور کیا؟ ایک سانجھا فقیر آٹھ سال کی روایات کے باوجود آن کی آن میں ٹھکرا دیا گیا۔ اللہ کے اس پیارے سے اب کوئی آنکھ بھی نہیں ملاتا۔ جس کے چرنوں

میں ساری ہائی اسٹریٹ کی دولت رہتی تھی، جس کے تصرف میں ساری قدرت رہتی تھی۔ اور جس کے اشارے پر جوانیاں ناچتی تھیں اس کی طرف آج کوئی منہ نہیں پھیرتا۔ اسے آج کھانے کو دو دن سے کچھ نہیں ملا......!

آخر ہوا کیا وہ کس سے پوچھے۔ آٹھ سال کسی سے بات نہیں کی۔ آج کیسے کسی سے پوچھ سکے۔ بھائی میں نے تم لوگوں کا کیا بگاڑا کہ تم نے مجھے ٹھکرا دیا، لیکن لوگوں نے اسے یکسر بھلا دیا۔ اب کوئی اس سے بچہ مانگنے نہیں آتا۔ کسی کو راکھ کی چٹکی درکار نہیں۔ دکانوں سے اسے ٹالنے کے عجیب حربے استعمال ہوئے۔ کہیں کہا جاتا کہ سیٹھ نہیں ہے۔ کہیں کہا جاتا کہ اندر خریدار ہیں۔ کہیں کچھ اور......اور پونڈرچ عجیب شش و پنج میں پڑا کہ آخر یہ سب کیوں اور کیسے ہوا۔؟

دفعتاً اسے یاد آیا۔ دو روز پہلے کی بات! پونڈرچ چل رہا تھا اور ایک بھکاری اس کے سامنے سے گزرا۔ پونڈرِچ نے اسے غور سے دیکھا۔ لگ بھگ چالیس سال کی عمر تھی۔ آنکھیں اندر دھنسی ہوئیں۔ چہرے کی ہڈیاں بھدّے طریقے پر ابھری ہوئیں، کان بہت بڑے اور سر چھوٹا۔ قد ٹھگنا اور ناک ناموزوں طور پر لمبی۔ پونڈرچ نے دل میں سوچا۔ شاید شیطان کی شکل ایسی لمبی ہی ہوگی نہ معلوم کیوں اسے اس شیطان پر غصہ آیا۔ وہ اس پر تھوکنا چاہتا تھا اسے گالیاں دینا چاہتا تھا۔ اور لوگوں کو خبردار کرنا چاہتا تھا.................. کہ لوگوں شیطان آیا ہے لیکن وہ پونڈرچ کے سوا اور کچھ نہ کہہ سکا۔ جس پر وہ بھکاری مسکرایا۔ اور پونڈرچ کی عظمت کو یک قلم نظر انداز کر کے آگے بڑھ گیا۔ شاید اسی دن سے لوگوں نے بھی اس کی درویشی کو نظر انداز کرنا شروع کیا۔ ہاں ہاں اسی دن سے۔ وہ کون ہوسکتا ہے؟ اس کا اور پونڈرچ کا کیا مقابلہ؟ کہاں وہ ایک گنجا بھکاری۔ اور کہاں پونڈرچ ایک پارسا درویش ایک دھرم کا اپدیشک اور ہندو مسلم اتحاد کا سنگم......ہی ہی۔ وہ ہنسنا چاہتا

تھا لیکن ہنس نہ سکا۔ اس کا پیٹ خالی تھا۔ دودن سے اسے کچھ بھی نہ ملا تھا۔ صرف پانی اور پانی سے تو بھوک کی آگ بجھتی نہیں۔ بلکہ زیادہ سلگ اٹھتی ہے اور اس کے پیٹ میں بھی آگ جل رہی تھی۔ پسلیوں میں درد ہو رہا تھا۔ اور کمر اینٹھ رہی تھی۔ وہ کیا جانتا تھا کہ ایسے بھی دن دیکھنے ہوں گے۔ کہاں وہ مرغن کھانے۔ وہ چٹنیاں۔ پلاؤ اور کہاں کچھ نہیں۔ اور کہاں اب دودن کا فاقہ ...... ڈراؤنی بھوک۔ موت سے زیادہ ہیبت ناک بھوک۔ کسے معلوم تھا یہ دن بھی آئیں گے۔ لیکن اب کیا کیا جائے؟

دن بھر کے کاروبار کے بعد دکانیں بند ہونا شروع ہو رہی ہیں۔ ٹریفک کم ہو چکا ہے۔ اور ابھی ۲۰۔۲۵ منٹ میں جگمگ کرتا ہوا ہائی اسٹریٹ سنسان پڑ جائے گا اور ساری رات بڑی بڑی عمارتیں سائیں سائیں کرتی رہیں گی اور کہیں کسی اونچی جگہ پر بیٹھ کر اُلو ہو ہو ہو کرتا ہوا روشنی کو کوستا رہے گا اور وہ ہوگا سیٹھ دونی چند کی دکان کے باہر ایک لکڑی کے تختے پر بھوکے پیٹ کو سینکتا اور کبھی چت اور کبھی پٹ لیٹتا۔ سیٹھ دونی چند نے تو وہ تختہ اسی کے لئے بچھوایا تھا۔ جب اس نے کسی بنگلہ پر رہنا پسند نہیں کیا تھا۔ وہ درویش تھا۔ اور درویش قالینوں اور غالیچوں پر کب سوتے ہیں؟...... وہ اس خیال پر مسکرایا اور ایک دکان کی طرف چلا...... سیٹھ دونی چند ہی کی دکان تھی۔ اور سیٹھ جی اندر بیٹھے دن بھر کا حساب لکھ رہے تھے۔ باہر دو چار قلی بیٹھے آپس میں باتیں کر رہے تھے۔

''پونڈرچ......''! وہ چلّایا۔ سیٹھ نے جیسے کچھ سنا ہی نہیں۔ برابر کھانے پر جھکا رہا اور آنکھ تک نہ اٹھائی۔ پونڈرچ سمجھا اور آگے چلا۔ قلی اس کے پیچھے ہنس رہے تھے اور زور زور سے باتیں کر رہے تھے۔ وہ کچھ سن نہ سکا۔ شاید اسی کے متعلق کچھ کہہ رہے تھے۔ لیکن کیا؟ وہ کیا کہتے ہوں گے کوئی آگے آ کر اس سے کہہ دے۔ کوئی کہتا ہی نہیں۔ وہ اپنے ارد گرد دیکھنے لگا کہ کہیں کوئی ہنسی مذاق کی بات تو نہیں۔ وہ آٹھ سال سے اسی طرح چلتا

آیا ہے اور آٹھ سال میں کسی نے اس پر ہنسنے کی جرأت نہ کی لیکن اب ......؟ اُف یہ لوگ بظاہر ایک دوسرے کے دشمن، ایک دوسرے سے روز جھگڑتے اور اسی سے تو ایک دوسرے کے خلاف خدا اور ایشور کے سامنے شکایات پیش کرواتے تھے۔ ایک دوسرے کا کاروبار بند کرنا چاہتے تھے۔ یہاں تک کہ ایک دوسرے کو مارنا چاہتے تھے۔ لیکن اب انہیں دیکھو منظم سازش کیے بیٹھے ہیں۔ ایک بھی غدار نہیں (جو آکر پونڈرچ سے یہ راز کہہ دے) اُف لوگ ایک دوسرے کے کتنے نزدیک ہوتے ہیں یہ لوگ......!

اور دکانیں بند ہو گئیں۔ قمقمے گُل ہو گئے۔ اور چاروں طرف اندھیرا محیط ہوا۔ ہائی اسٹریٹ کی اونچی مہیب عمارتیں خاموش ستاروں کو کھانے چلی جارہی تھیں اور ستاروں کی شرارت بھی دیکھو۔ ڈرنے کی بجائے آنکھ مارتے ہیں۔ وہ مسکرایا اب اس نے اپنے آپ کو بیچ سڑک میں کھڑا پایا۔ وہ اب سونا چاہتا تھا۔ ٹانگیں دُکھ رہی تھیں اور بازو تھک چکے تھے۔ اس کا گلا خشک ہو رہا تھا۔ اور منہ میں تھوک کا نام تک نہ تھا۔ کمر بدستور اینٹھ رہی تھی اور پیٹ کی آگ جیسے گردوں کو جلا رہی تھی اس نے جا کر کسی نزدیکی نل پر پانی پینا چاہا۔ لیکن ......تھکاوٹ نے اسے چلنے سے روک دیا۔ اور اس نے فیصلہ کیا کہ سیٹھ دونی چند کے تختے پر آرام کیا جائے۔

سیٹھ دونی چند کی دکان کے باہر آج اس کا تختہ نہیں تھا۔ آٹھ سال سے وہ اس تختے پر سو رہا تھا، لوگوں نے قیمتی کپڑے لا لا کر اس کے تختے پر بچھانے چاہے کہ درویش کو تکلیف نہ پہنچے۔ لیکن درویش کبھی نہ مانا۔ اسے اس تختے کے ساتھ ایک انس سا ہو چکا تھا۔ لیکن آج وہ تختہ بھی نہیں۔ اسے ایک دھچکا سا لگا۔ اور وہ ویسے ہی اینٹوں کے فرش پر لیٹ گیا۔ نیند اُسے آئی نہیں۔ سارے جسم میں درد ہو رہا تھا۔ وہ آسمان پر ٹمٹماتے تاروں کو دیکھتا رہا......اسے اپنا بچپن یاد آنے لگا۔ وہ گاؤں کی پتلی پگڈنڈیاں، دھان کے ہرے ہرے

کھیت اور وہ جنگل ۔ جنگل سے تو اسے اتنا ہی پیار تھا جتنا اس لکڑی کے تختے سے ۔
یا......یا......وہ کانپ اٹھا......اسے کسی اور سے بھی پیار تھا۔ ہاں اسی کے لئے تو اسے جنگل
بھی پیارا لگتا تھا۔ اور اس نے محسوس کیا کہ وہ پیڑ کے نیچے بیٹھا بنسری بجا رہا ہے ۔شام
ہو چکی ہے اور نیلے گہرے آسمان پر، پہلا چاند بالکل اسی طرح نمودار ہوا جس طرح اس کی
سفید کاغذ کی ناؤ اس چھوٹی سی ندی میں اور سبزی میں چھپے مینڈک اچھلتے کودتے رہتے ۔ اوور
دور کہیں سے کسی کی آواز آئی...... ''آئی ہو!''

اور وہ آئی، ہولے ہولے،! چپکے چپکے اور دبے پاؤں جیسے چاندنی کی ڈولی میں
ہوا کے کندھوں پر سوار ...... ہاں وہ آئی ، وہ آئی ۔ اور وہ اٹھا اور اس کی طرف دیوانہ وار
دوڑنے لگا۔ لیکن اس کا پیر پھسل گیا۔ اور وہ سر کے بل گر پڑا۔ اسے سخت چوٹ آئی
......دفعتاً وہ چونک اٹھا، پولیس کا سپاہی......اپنے بوٹ سے اسی کے سر کو تھپکیاں دے دے
کر اسے جگا رہا تھا۔

''اے یہاں سے اُٹھو۔ چوری ہو جائے گی دکان کی'' پولیس والے نے کہا۔

چوری! لیکن وہ تو آٹھ سال سے یہاں سو رہا ہے اور آٹھ سال سے یہاں کبھی
چوری نہیں ہوئی ۔ وہ پولیس والے کو سمجھانا چاہتا تھا کہ بھئی تم غلط دیکھ رہے ہو۔ میں درویش
ہوں درویش!......لیکن پولیس والا چلاّ کر بولا۔ ''اٹھنا ہے کہ نہیں''؟

وہ بھی چلایا۔ ''پونڈرچ!'' اور ایک طرف بھاگ چلا۔

بھاگتے بھاگتے وہ ایک باغ میں پہنچا۔ ٹھنڈا ٹھنڈا سبزہ اس کے جسم کو اپنے اندر
چھپانے کی کوشش کر رہا تھا۔ پھولوں کی مہک نے اس کے تھکے ماندے دماغ کو معطر کیا اور
صبح جب اس کی آنکھ کھلی تو دن بہت چڑھ آیا تھا۔ آنکھ اٹھا کر دیکھا۔ کلی اس کی طرف دیکھ کر

مسکرائی اور پھول نے بڑے بوڑھوں کی طرح سنجیدگی سے سر ہلایا۔ وہ خوش ہوا اور کچھ کھانا چاہتا تھا نا۔ کھانا...... کتنا میٹھا نام ہے۔ یاد آتے ہی منہ میں پانی بھر آتا ہے۔ نمکین کھانا، کھٹا کھانا اور میٹھا کھانا...... لیکن کہاں سے کھایا جائے؟ کوئی دیتا نہیں اس نے پھولوں کی طرف دیکھا۔ پھول نے سر ہلایا۔ جیسے کہہ رہا ہو۔ بندہ حاضر ہے اور اس نے جا کر ایک پھول توڑا۔ اور اسے منہ میں ڈال کر خوب چبایا...... کھٹا کھانا...... لیکن کھانا تو ہے...... اس نے ایک اور کھایا...... پھر ایک اور...... اور پھر سوچا کھانے سے انسان کو کتنی محبت ہے۔ انسان کسی بھی چیز کی جدائی میں زندہ رہ سکتا ہے۔ ماں، باپ، بہن، بھائی اور...... نہیں نہیں، میں اس کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتا۔ وہ میری ہے میری...... وہ ایک لمحے کے لئے ساکن رہا۔ اس کے لئے جیسے دنیا رک گئی۔ آسمان پر سورج ساکت ہو گیا اور وہ چلتی پھرتی گاڑیاں، تانگے اور انسان ایک دم رک گئے۔ پھر وہ مسکرایا اور پھر اُسے خیال آیا۔ آٹھ سال سے تو اس کے بغیر بھی زندہ ہوں'' اس نے سوچا'' لیکن کھانا؟...... اب تو تیسرا دن ہے اور یہاں تو...... خیر!''

جہاں وہ صبح سویرے بیٹھے، شام تک اٹھنے کا نام نہیں لیتا تھا یہ اس کی آٹھ سال کی عادت تھی۔ آٹھ سال کی کیا اس سے پہلے بھی وہ جنگل میں صبح بیٹھتا اور رات گئے اٹھتا تھا۔ اور وہی عادت اس نے ہائی اسٹریٹ میں بھی قائم رکھی تھی۔ ہر صبح لوگ اسے ڈھونڈنے آتے اور جب تک اس کے درشن نہ ہوتے دکانیں نہ کھولتے۔ اور آج بھی وہ حسب معمول ایک جگہ بیٹھا رہا۔ لیکن کوئی اسے دیکھنے نہیں آیا۔ کسی نے دکان کھولنے سے پیشتر اس کا درشن ضروری نہ سمجھا کسی نے اس کے لئے کھانا نہ پکایا تھا۔ شاید لوگ اسے بھول چکے تھے۔ شاید وہ مر چکا تھا...... لیکن بھوک سے کیسے نپٹا جائے...... وہ کچھ سمجھ نہ سکا اور خود جا کر ہائی اسٹریٹ میں لوگوں کو درشن دیتا۔ اور کہتا تمہارا درویش اب مر رہا ہے۔ مرتے وقت اپنے ہاتھوں سے پانی تو پلاؤ۔ چلو کھانا نہ سہی لیکن میری طرف دیکھو، دیکھو میری حالت کیا ہو گئی ہے۔ کیا

میں......تمہارا......عاشق نہیں؟ اسے محسوس ہوا کہ وہ سچ مچ لوگوں پر فریفتہ ہے ان کے بغیر اس کی زندگی سونی سی ہو چکی ہے۔ محبوب اس سے روٹھ گیا ہے تو کیا ہوا۔؟ وہ پاؤں پکڑ کر اسے منائے گا۔ وہ تو......وہ تو پڑتا تھا اپنی محبوب کے......اس کا سر چکرایا۔ ایک خفیف سی مسکراہٹ اس کے جلے ہونٹوں پر پھیل گئی۔ لیکن وہ دن کے وقت ہائی اسٹریٹ میں نہیں جا سکتا۔ لوگ نہ معلوم کیا سمجھ بیٹھیں گے......اُف وہ تو کبھی دن کے وقت بازاروں میں نہیں پھرا ہے۔ اور اگر اب اپنی عادت کے خلاف بازاروں میں چلے تو شاید لوگوں کے شکوک اور بڑھ جائیں۔ شاید وہ اس کا امتحان کرتے ہوں اور بازاروں میں دیکھتے ہی اس کی درویشی جاتی رہے گی۔ اور لوگ ایک دوسرے سے کہیں گے۔ دیکھا بھی' یہ بھی کوئی درویش ہوا۔ اور وہ ہنسیں گے اور بچے اس کے پیچھے پتّھر پھینکیں گے۔ کوئی ان کو روکے گا نہیں۔ یہ سازش ہے......ہاں یہ سازش ہے۔

اور جب تک سورج آکاش کو ناپتا رہا وہ اسی باغ میں اسی جگہ لیٹا رہا۔ بھوک تو اب مر چکی تھی۔ آنکھیں لال ہو گئی تھیں اور چہرے سے راکھ مٹ چکی تھی۔ اور اس کی ٹانگیں اٹھنے سے معذور دکھائی دے رہی تھیں۔ اور سینہ ایک خالی ڈبہ کی طرح سانس سے بج رہا تھا۔ کانوں میں آبشاروں کے گرنے کی آوازیں آ رہی تھیں اور کبھی کبھی ساری دنیا گول گول دائروں میں ناچتی دکھائی دے رہی تھی۔ وہ اپنی اس حالت پر ہنسنا چاہتا تھا لیکن ہونٹ عجیب صورت میں سکڑ کر چپک گئے اور تھوڑی دیر میں اس نے اپنے کو دل ہی دل میں روتے ہوئے پایا۔ اس کے دل سے جیسے ایک بڑا بوجھ ڈھل گیا......لیکن اب تو سورج غروب ہو چکا تھا اور وہ اٹھ کر بازار میں جا سکتا تھا۔ باغ کے اندر بھی لوگ سیر کرنے کی غرض سے آنے لگے تھے اور اس نے سوچا کہ گیٹ پر کھڑا رہا جائے شاید کچھ ملے وہ اٹھا اور چلنے لگا۔ ٹانگیں اس کے جسم کو توازن میں نہ رکھ سکتی تھیں۔ اور اس کا سر بھی تو لٹک رہا تھا۔ وہ اپنی بے بسی پر حیران ہوا گیٹ باغ کی

سطح سے کچھ اونچا تھا۔ اور اس کے ایک طرف گندے پانی کا ایک حوض تھا۔ جس کا ڈھکنا ورزش کرنے والے پہلوانوں نے اٹھا کر اپنے استعمال میں رکھا تھا۔ حوض کا منہ بھولے دیو کی طرح کھلا تھا۔ وہاں پہنچ کر پونڈرچ نے جیسے یمدود کو بیٹھا پایا۔ وہ ڈرا کہ کہیں اس کا لقمہ نہ بنے اور پھر چڑھائی چڑھنا تھی۔ بڑی مشکل سے آہستہ آہستہ سنبھل کر گیٹ تک پہنچا۔ اس کا سانس پھولا اور ایک منٹ کے لئے وہ دم سنبھالنے بیٹھا اور پھر کھڑا ہوا۔

لوگ آرہے تھے...... پہلوان لوگ، خوش فکرے لونڈے، زرق برق ساڑھیوں اور نقابوں میں پھٹی پھٹی قوسیں دکھاتی ہوئی بیبیاں، بوڑھیوں کی آنکھ بچا بچا کر اپنی نمائش کرتی ہوئی باغ میں آرہی تھی۔ اور پونڈرچ گیٹ پر کھڑا خدا کی شان دیکھ رہا تھا۔ ان میں سے کسی کے سامنے بھی اس نے ہاتھ نہ پھیلایا۔ وہ جانتا تھا کہ اگر ان میں سے کسی سے کچھ مانگا جائے تو شاید ملے گا لیکن نہیں وہ ان سے نہیں لے گا۔ ہاں اگر ہائی اسٹریٹ کا کوئی آدمی آئے تو اس سے لے گا۔ انھوں نے ہی تو پہلے اسے درویش بنایا۔ اور پھر اس بُری طرح دھتکار دیا۔ نہیں وہ انھیں سے لے گا اور کسی سے نہیں۔ جیسے وہ ہٹ پر آمادہ تھا کہ اگر کھاؤں تو انہی کا کھاؤں اگر پیوں تو انہی کا۔ اگر نہیں تو کچھ نہیں۔ اس آٹھ سال کے عرصے میں اس ہائی اسٹریٹ کے لوگوں کے ساتھ ایک خاص رشتہ سا ہو گیا تھا، جو وہ اب محسوس کر رہا تھا۔ اور پوری شدت کے ساتھ اور اسی رشتے کو نبا کے لیے وہ شاید کسی اور سے نہیں ہائی اسٹریٹ کے جانے پہچانے لوگوں سے کچھ کھانے کے لئے لے گا اور اس کی نظر ہائی اسٹریٹ کے ایک مفلوج سیٹھ پر پڑی۔ جو پہیوں والی کرسی پر بیٹھا تھا اور ایک دایہ اسے ڈھکیلتی ڈھکیلتی باغ کی طرف لا رہی تھی۔ ''بغیر ٹانگوں کے سیٹھ'' نے آج اپنے آپ کو خوب نکھارا تھا۔

سفید سفید بالوں کو چیر کر دو حصوں میں تقسیم کیا تھا۔ اور بھورے بھرے بھرے گالوں کو ویزلین سے چکنا کر دیا تھا۔ وہ خوب ہنس ہنس کر اور دایہ کی طرف مڑ مڑ کر چہکتا تھا۔

پونڈرچ کواس پر ایک مبہم سا رحم آنے لگا۔ اوراس جیسے سیٹھ پر احسان جتا کر فیصلہ کیا کہ اس سے مانگ لینا چاہیے اور جونہی سیٹھ کی کرسی اس کے نزدیک پہنچی ۔ پونڈرچ چلایا۔ سیٹھ پر ایک عجیب سی حالت طاری ہوئی ۔ وہ چھوٹے بچوں کی طرح خوف زدہ ہوا۔ جیسے اس نے یہ لفظ عمر میں پہلی بار سنا تھا۔ اور پھر اتنے زور سے......وہ بچے کی طرح مچل گیا۔

''آیا اسے ہٹاؤ۔''

اور آیا تھی خوب ہٹانے والی ۔ ایک فربہ اندام سیاہ عورت ۔اس نے ہٹانے کا مطلب ڈھکیلنا سمجھا۔ اور کرسی چھوڑ کر وہ پونڈرچ سے باقاعدہ نپٹنے لگی لیکن کرسی آپ سے آپ باغ کی طرف دوڑی، سیٹھ کافی چیخا چلایا لیکن جب تک آیا کرسی کو پکڑنے پہنچی سیٹھ بے چارا اوندھے منہ گندے حوض میں تیر رہا تھا۔ بچارے سیٹھ اور اس کی آیا کے لیے مصیبت تھی ۔ مگر لوگوں کی طرف دیکھو بجائے مدد کرنے کے ہنسی سے لوٹ پوٹ ہو رہے ہیں ۔ اور حوض کے اردگرد اس طرح جمع ہو رہے ہیں جیسے سیٹھ حوض میں نہیں تیرتا بندر ناچ رہا ہے۔

پونڈرچ خوش ہوا۔ اس کے دل کو کچھ تسکین سی ہوئی ۔ اس نے سیٹھ کو یہ سزا دے کر جیسے لوگوں کو اپنا طرف دار بنایا، لوگوں کا سیٹھ کی امداد نہ کرنا اور اس کی مصیبت پر ہنسنا۔ پونڈرچ کو اس سے ایک روحانی لطف حاصل ہوا اور وہ ہنس پڑا......وہ اتنا ہی نہیں بہت ہنسنا چاہتا تھا۔ اس لئے باغ کے ایک کونے میں چلا گیا۔ جہاں پر اس نے پُر زور قہقہے لگائے ۔ وہ سیٹھ کی بے بسی پر ہنس رہا تھا۔ ہائی اسٹریٹ کی اونچی عمارتوں سے اپنے قہقہے ٹکراتا تھا۔ قلیوں کے گنوار پن پر عینکوں کے پیچھے حسرت زدہ آنکھوں پر وہ بہت ہنسا...... بہت ہنسا اور پھر اسے بھوک محسوس ہوئی ۔ اس نے سوچا کہ یہ اس کی بھوک کا آخری وار ہے اور اگر اب بھی کھانے کے لئے کچھ نہ ملا تو زندگی کا تانا بانا ٹوٹ جائے گا۔ اور یہ آگ اسے ہمیشہ ہمیشہ کے لئے بھسم کردے گی ۔ وہ راکھ کا ایک ڈھیر بن جائے گا۔ اور صبح کی ہوا اسے سارے چمن

میں بکھیر دے گی۔ اور سبزے اور پھولوں کا منہ راکھ سے سیاہ پڑ جائے گا جس طرح اس کا منہ چند دن پیشتر تھا۔ جب وہ ہائی اسٹریٹ کا فقیر تھا۔

فقیر کا خیال آتے ہی وہ پھر ہنسنے لگا۔ لیکن اس کے ہونٹ پھر عجیب طریقے سے سکڑ کر چپک گئے۔ اور اس کا دل رونے لگا۔ وہ مرنا نہیں چاہتا تھا۔ وہ بھسم ہونا نہیں چاہتا تھا۔ بلکہ اسی طرح حقیقت بن کر سارے ہائی اسٹریٹ پر قہقہے مارنا چاہتا تھا اور اس نے سوچا کہ اب چلنا چاہیئے۔

رات بہت ہو چکی تھی۔ باغ سے سب لوگ چلے گئے تھے۔ اور ہائی اسٹریٹ کی دکانیں بند تھیں وہاں کی عمارتیں آج پھر ڈراونی اور مہیب دکھائی دے رہی تھیں۔ اور سائیں سائیں کرتی تھیں اندھیرا کافی تھا، وہ بہت مایوس ہوا۔ اگر آج بھی اسے بھوکا سونا پڑے تو صبح تک وہ مر چکا ہوگا۔ اور سونا تو بھوکا ہی تھا۔ کیونکہ اب کسی سے کچھ ملنے کی امید نہ تھی۔ اور نہ ہی کوئی آدمی کہیں نظر آتا تھا۔ وہ واپس باغ کی طرف آیا اور گیٹ پر کھڑا رہا۔ وہ سوچنا چاہتا تھا۔ لیکن دماغ میں ہزاروں، لاکھوں خیالات آنے کے باوجود ایک بھی خیال ایسا الگ تھلگ نہ تھا جس پر سوچا جا سکے۔ ایک عجیب الجھن سی تھی۔ اور وہ اسی الجھن میں پڑا باغ کے گیٹ سے تکیہ لگائے کھڑا رہا۔ اور اسے کسی کے چلنے کی آواز سنائی دی۔ چپ راست، چپ راست، چپ ٹھن اور آواز قریب آتی رہی۔ اس نے دیکھا کہ کوئی جا رہا ہے۔ سوچا کہ اس سے کچھ لوں گا۔ لیکن جلد ہی ایک اور خیال آیا۔ اور کشمکش سی پیدا ہوئی "چلو چھوڑو" وہ اپنے آپ سے کہہ رہا تھا۔ "یہ دے گا کچھ نہیں۔ خواہ مخواہ......تو کیا میں مرنا چاہتا ہوں۔؟ نہیں نہیں اسے کچھ ضرور دینا چاہیئے۔ ضرور ضرور"۔

اور کوئی انسان اس کے پاس سے گزرا۔ وہ اس کے پیچھے پیچھے چلا...... پانچ گز سات گز......آدمی نے مڑ کر دیکھا اور پوچھا "کون ہو تم" وہ کچھ کہہ نہ سکا۔ آدمی پھر

آگے چلا۔اور پونڈرچ اس کے پیچھے پیچھے لڑکھڑاتا ہوا چلا۔وہ پھر ٹھہرا اور کرخت لہجے میں بولا ''بھئی کون ہوتم۔''؟

پونڈرچ خاموش رہا۔کوئی جواب نہ پا کر آدمی تیزی سے چلا۔اور پونڈرچ نے سوچا کہ اس اگلے نکڑ سے وہ دائیں جانب چلا جائے گا ادھر کچھ ملنے کی توقع نہیں۔وہ بھی تیزی سے چلا۔اور اس آدمی کے بالکل قریب پہنچا۔وہ اس سے بات کرنا چاہتا تھا۔سارا ماجرا کہنا چاہتا تھا اور اس سے پوچھنا چاہتا تھا کہ آخر لوگوں نے اسے چھوڑا کیوں۔؟لیکن وہ آدمی پونڈرچ سے بہت ڈرنے لگا۔اور اب دوڑنے ہی لگا تھا کہ پونڈرچ اس کے سامنے اس کا راستہ روکتا ہوا کھڑا ہوا۔خوف اور دہشت نے اس آدمی کو اپنی گرفت میں لے لیا۔اور اس نے دیکھا کوئی اس کا گریبان پکڑنے کی کوشش کررہا ہے۔بہت زور سے چلایا ''چور، چور......''!

اور چور نے بھی غل مچایا...... ''پونڈرچ!''

آواز سنتے ہی جیسے اس آدمی میں پھر سے جان آئی۔اس نے پونڈرچ کو پکڑ کر بہت پیٹا۔اور ساتھی ہی چور چور بھی چلاتا رہا۔پولیس موقع واردات پر پہنچی اور پونڈرچ کو گرفتار کرلیا گیا۔

رات بھر اس پر کیا گزری یہ پونڈرچ کو معلوم نہیں لیکن صبح جب اس کی آنکھ کھلی تو وہ حوالات کی کوٹھری میں بند تھا۔جس کے دروازے پر لوہے کی لمبی لمبی سلاخیں لگی تھیں اور باہر ایک سپاہی بندوق کندھے پر رکھے چپ راست، چپ راست پہرہ دے رہا تھا۔

ساتھ کے کمرے میں کوئی بول رہا تھا حضور یہ بدمعاش ہے۔اس نے اپنے گاؤں کی ذیلدار کی بیٹی کو تباہ کرڈالا ہے جس پر آج سے آٹھ سال پہلے ذیلدار صاحب نے

اسے وہاں سے جلاوطن کر دیا۔ اور شہر آ کر وہ درویش بن بیٹھا۔"

"لیکن یہ معاملہ آٹھ سال کے بعد کس نے بتایا۔؟ کوئی پوچھ رہا تھا۔

"حضور ہائی اسٹریٹ میں ایک اور بھکاری آیا ہے۔ اسی نے......"

اور پونڈ رچ کے سر پر جیسے بجلی گری۔ وہ اس کے آگے کچھ سن نہ سکا۔ اسے اپنا گاؤں یاد آیا۔ محبوبہ یاد آئی۔ اور وہ جنگل یاد آیا......وہ انہیں ایک بار دیکھنا چاہتا تھا۔ ایک بار اور صرف ایک بار......اسے ایک ٹھگنا شیطان بھی یاد آیا۔ جس کا سر چھوٹا ناک لمبی اور کان بڑے تھے۔ ہاں وہی بھکاری جو اس نے پرسوں دیکھا تھا۔ اور جس نے اس کی طرف دیکھ کر مسکرایا تھا۔ وہ اسے گالیاں دینا چاہتا تھا۔ اسے پکڑ کر پیٹنا چاہتا تھا۔ لیکن اس کے سب خیالات بلغم کے ایک بڑے لوتھڑے کی طرح جمع ہوئے ایک مہمل لفظ بن کر یک لخت منہ سے نکلے......"پونڈ رچ!"

اس پر پہرے کا سپاہی ہنسا۔ اور اس کی لمبی سیاہ مونچھیں کوّے کے پروں کی طرح پھڑ پھڑائیں۔

پاپی پُجاریوں کی سنتان

علی محمد لون

اُس بڈھے سے مجھے کتنی نفرت ہے!

تم نے کلہن پنڈت کی راج ترنگنی پڑھی ہے؟

نہیں صرف نام ہی سُنا ہے۔

راج ترنگنی میں سی نگر کے سبھی تاریخی محلوں کا ذکر ہے۔ اس محلے کا بھی اُس میں ذکر ہے۔

یہ بُڈھا کتنا پڑھا لکھا ہے؟ میں تو اسے بدھو سمجھتا تھا!

کہتے ہیں گوری بل سے کچھ دور دیوی کا استھاپن تھا۔ وہاں جتنے پُجاری تھے، وہ سنسکاروں کا پالن کرنے کے لئے کوئی بھی بلیدان کرتے تھے۔ لیکن تم جانو۔ آدمی پجاری ہو یا گرہست۔ آخر ہے وہ انسان ہی۔ دیوی کے استھاپن میں کچھ پجاری سنسکاروں پر چل نہ سکے۔ انہوں نے پیاز کھائی۔

یہ بُڈھا خواہ مخواہ اِدھر اُدھر کی ہانک رہا ہے۔ معلوم ہوتا ہے آج بھی مطلب کی بات نہ ہو سکے گی اس سے۔ خواہ مخواہ چائے کی ڈز پڑ گئی۔ اب بتاؤ مجھے پیاز سے کیا دِل چسپی ہے؟

پیاز اس زمانے میں بری چیز سمجھی جاتی تھی۔ خاص کر دیوی کے اپاسکوں کے لئے تو اور بھی خراب۔ لیکن انہوں نے پیاز کھائی پھر ایک سبھا ہوئی۔ جس میں پاپیوں کو دنڈ دیا

گیا۔ مسلمان ہوکر یہ بڈھا ہندوؤں کی طرح سنسکرت بول رہا ہے! حد ہے!!

انہیں دیش نکالا دیا گیا۔ دیش نکالا جانتے ہو کیا ہوتا ہے؟ میرا منہ کیا دیکھ رہے ہو؟ جواب دو! تم تو پڑھے لکھے ہو۔ رئیسِ شہر ہو تمہاری اتنی بڑی بزنس ہے۔ تم نے دنیا دیکھی ہے۔ بتاؤ دیش نکالا کیا ہوتا ہے؟

ہوگا کچھ!

تمہیں میری باتوں سے کوفت ہو رہی ہے نا؟ لیکن یہ باتیں بہت ضروری ہیں۔ دیکھو تم اس علاقے میں آ بسے ہو، جس علاقے میں رہو اُس کی تاریخ تو کم از کم جاننا ضروری ہے۔

آگ لگے ایسی تاریخ کو! میرے گیراج کا کیا ہوگا؟

ہاں تو میں دیش نکالا کی بات کر رہا تھا۔ دیش نکالا ہوتا ہے، دیش سے نکالنا۔ یا جب اس کے معمولی مطلب لیتے ہیں تو اسے گھر سے بے گھر کرنا بھی کہیں گے، تو ان پجاریوں کو دیش نکالا دیا گیا۔ انہیں دیوی کے پوتر استھاپن سے نکال کر اس علاقے میں بسایا گیا۔ یہ علاقہ تب تھا بھی کیا؟ یہ سلیمان کوہ تھا، ایک طرف، اور دوسری طرف ڈل جھیل تھی۔ سردیوں میں جھیل کا پانی کم ہو جاتا، تو تھوڑی سی زمین نکل آتی۔ گرمیوں میں جھیل کا پیٹ پھول جاتا۔ تو یہی زمین پھر سے پانی سے لبالب بھر جاتی۔ بس سمجھو ویسی ہی بات ہوئی، سامنے کھائی پیچھے پہاڑ۔ لیکن ...... پجاریوں کی اولاد بڑی جفاکش نکلی۔ انہوں نے سلیمان کوہ سے پتھر اور مٹی لی اور جھیل کے اس کنارے میں بچھائی۔ اسی طرح برسوں کی...... مسلسل محنت کے بعد انہوں نے یہاں سے گوری بل تک زمین کا ایک بہت بڑا ٹکڑا بنالیا۔ جس پر ایک طرف انہوں نے اپنے رہنے کے لئے گھر بسائے اور دوسری طرف گیہوں اور

مکئی کی کاشت شروع کی۔ آبادی کم تھی اور زمین زیادہ۔ اس لئے انہوں نے باقی بچی زمین میں باغ لگائے، سیبوں، ناشپاتیوں اور انگور کے باغ۔ جو زمین اب بھی دلدل تھی۔ اس کے کناروں پر بیدوں کے پیڑ اُگائے۔

اُف یہ آدمی مجھے کتنا بور کر رہا ہے! ٹوک نہ دوں اسے ابھی؟

ارے تم سے ایک بہت ضروری بات کہنا ہی بھول گیا۔ انہیں یہ بھی کہا گیا تھا کہ وہ گوری بل سے اُدھر کا رخ نہ کریں۔ پجاریوں کو دیوی سے چھوٹنے کا غم تو تھا۔ لیکن تم جانو جس طرح آدم اور حوا جنت سے نکل کر زمین پر آ گئے، تو انہوں نے اتنی بڑی دنیا بسائی۔ پجاریوں نے بھی ایک چھوٹی سی دنیا آباد کی۔ اور سب سے پہلے انہوں نے زمین میں جو چیز بوئی۔ جانتے ہو وہ کیا تھی؟

پیاز ہوگی۔

ارے ہاں پیاز ہی تھی۔ پھر ایک عجیب بات ہوگئی۔

جی؟

بیدوں کے پیڑ اُگ آئے۔ تو کہیں سے کستور اور پوشنول اڑ کر آ گئے اور انہوں نے پیڑوں میں گھونسلے بنائے۔ سیبوں اور ناشپاتیوں پر شگوفے نکلے۔ تو جانے کہاں سے شہد کی مکھیوں کی رانی آ گئی۔ کھیتوں میں گیہوں اور مکئی لہرانے لگی، تو جانتے ہو کیا ہوا؟

کہیں سے ریچھ آیا ہوگا یا گیدڑ۔

نہیں۔ وہ جو سلیمان کوہ کی اونچی چوٹی ہے نا؟ جس پر اب مندر ہے۔ وہاں سے پریوں کے دَن دُن کی آوازیں آنے لگیں۔ یہ سب ہوا تو پجاریوں کو اس علاقے سے اتنا ہی

پریم ہو گیا، جتنا انہیں دیوی کے استھاپن سے تھا، اور یہ پریم ہزاروں برس گذرنے کے بعد بھی جوں کا توں موجود ہے۔ اس علاقے کی ایک ایک انچ زمین سے انہیں پیار ہے۔

ہاں جبھی تو کوڑیوں کے مول بیچ رہے ہیں۔ یہی حالت رہی تو اک دن ان سالوں کو ایک بار پھر دیش نکالا مل جائے گا اور اس علاقے پر ہمارا قبضہ ہوگا۔ ہمارے نئے اُبھرنے والے طبقہ کا۔ جس کے پاس کوٹھیاں ہیں، موٹر ہیں، بینک بیلنس ہیں۔ کانونٹ کی تعلیم ہے، کلب اور ہوٹلوں کی زندگی ہے۔ اور تم لوگ نالی میں رینگنے والے کیڑوں کی طرح ہمارے چھوڑے ہوئے علاقوں میں جا بسو گے۔ لیکن یہ بڈھا اپنے مطلب کی بات کئے جا رہا ہے، اور میرے مطلب کی بات کہیں گول ہو رہی ہے۔ یہ نہ مانا تو میرے آؤٹ ہاؤس اور گیراج کا کیا ہوگا؟

حالانکہ اس علاقے کے تین چوتھائی زمین پر اب تم لوگوں کا قبضہ ہے۔ مجھے ڈر ہے کہ کہیں پجاریوں کی اولاد کو ایک بار پر دیش نکالا نہ ملے۔

ارے کہاں؟ ذرا سی زمین تو خریدی ہے میں نے!

تم نہیں، تمہارے بھائی بندوں کی بات کر رہا ہوں۔ تم تو میرے جگری دوست محمد سلطان خواجہ کے بیٹے ہو۔ مرحوم کے رشتے سے تو میرے بھتیجے ہو۔ کوئی غیر نہیں ہو۔

واہ ابا جان تمہارا بھی جواب نہیں۔ مر کے بھی کام آ رہے ہو!

سنو، تم سے پہلے پہل کچھ حماقتیں ہو گئیں۔ اور ہم نے اپنی دھرتی لوگوں کو بیچ ڈالی۔ تمہیں معلوم ہے جس جگہ گل محمد نے کوٹھی بنائی ہے، وہاں کیا تھا پہلے؟

نہیں۔

وہاں ایک میدان تھا۔ ہم سب اسی میدان میں کھیل کر جواں ہوئے تھے۔

ہماری گائیں اور بھیڑ بکریاں اُسی میدان کی گھاس کھا کر صحت مند رہتی تھیں۔ ایک طرف لڑکے بالے فٹ بال اور کبڈی کھیلا کرتے تھے، اور دوسری طرف ہماری مائیں یا بہنیں اور بیٹیاں دھان سکھاتی تھیں۔ دھان کوٹتی تھیں، اور عید کے دن رُوف کیا کرتی تھیں۔ اب ہمارے بچے گلی کوچوں میں دھول اور گرد کے ساتھ کھیلتے ہیں، اور ہمارے مویشی کمزور ہو ہو کر مر رہے ہیں۔ ہمیں اچھا دودھ نہیں ملتا اور ہماری صحت خراب ہو رہی ہے۔ ہمارے بچوں کی صورت دیکھو تو فاقہ زدوں کا گمان ہو۔ پرسوں تمہارا لڑکا، کیا نام ہے اس کا؟

پِنکی۔

ہاں وہی ڈیوڑھی سے نکل کر گلی میں آ گیا، اور ہمارے بچوں کے ساتھ کھیلنے لگا۔ تم جانو۔ ہمارے بچوں کے کھلونے نہیں ہوتے۔ بس کوئی ٹین کا ڈبہ اٹھایا، اسے بجالیا اور کھلونا ہو گیا۔ یا کمہاروں کے ہاں سے مٹی کا کوئی گھوڑا، کوئی ڈولی یا چھوٹا سا کوزہ لے آئے، تو اسی سے کھیلنے لگے۔ تمہارا لڑکا کیا نام ہے اس کا؟

پِنکی۔

ہاں پنکی بھی ہماری بچی راجہ سے ڈولی اور دُلہن کا کھیل کھیلنے لگا۔ مجھے بڑی خوشی ہوئی، کہ تمہارا لڑکا ہماری بچی کے ساتھ گھل مل گیا ہے۔ جانے کس بات پر دونوں نے زور زور سے تالی بجائی۔ اندر ڈیوڑھی سے تمہاری بڑی بچی کیا نام ہے اُس کا؟

ببلی۔

ہاں ببلی نکل آئی۔ اُس نے پنکی کو کان سے پکڑ کر گھسیٹنا شروع کیا۔ میری راجہ ڈر کر بھاگ گئی۔ اس کے ہاتھ سے مٹی کی ڈولی گری اور ٹوٹ گئی۔ تمہاری سہیلی نے پنکی کے کہا۔

''ہائے یہ بُڈھا جانے اب کیا کہہ دے گا! میرے ہی گھر میں بیٹھا ہے اور میرے ہی بچوں کی برائی کررہا ہے!!''

''سنتے ہو کیا کہا؟''

''کیا؟''

''کہا کہ ان گندے کشمیری بچوں کے ساتھ کیوں کھیلتے ہو؟ بیمار ہو جاؤ گے! مجھے بلی کی بات پر زور کی ہنسی آئی۔''

ہاں ویسی ہی ہنسی، وہی منحوس ہنسی، تم ہنستے ہو تو تمہارا مُنہ بوسیدہ قبر کی طرح کھل جاتا ہے۔ آنکھیں جھریوں میں ایسے ڈوب جاتی ہیں۔ جیسے سانپ من نگل جاتا ہے۔ سر ایسے ڈولتا ہے، جیسے کشتی طوفان میں گِھری ہوئی ہو!

مجھے بڑے زوروں کی ہنسی آئی اور بلی مارے ڈر کے ڈیوڑھی میں چلی گئی، میں نے سوچا کہ تمہاری بچی بھی تو کشمیری ہی ہے۔ پھر اس نے یہ کیا کہہ دیا؟

بات دراصل یہ ہے کہ بلی کانونٹ میں پڑھتی ہے۔ جہاں صفائی کا بہت خیال رکھتے ہیں، مانتا ہوں، مانتا ہوں۔ لیکن صاف رہنے کا مطلب یہ تو نہیں، کہ تم کشمیری ہی نہیں رہے؟

یہ بڈھا کس صفائی سے مجھے کارنر کررہا ہے! اب کیا جواب دُوں؟

بولو۔ جواب دو!

کیوں نہیں رہے کشمیری؟ اصل بات یہ ہے کہ یہ کانونٹ والے جانے کیا غلط سلط تعلیم دیتے ہیں۔ پڑھاتے ہیں انگریزی میں، نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ ہمارے بچوں کو اپنی زبان بہت بری نظر آتی ہے۔ وہ سمجھتے ہیں کہ اس زبان میں بات کرنا بھی گناہ ہے۔ کیونکہ

ایسا نہ ہوتا، تو انہیں اس زبان میں تعلیم کیوں نہ دیتے؟

واہ جو لوگ اپنی زبان سے نفرت کرتے ہیں۔ ظاہر ہے وہ اپنے لوگوں سے بھی نفرت کریں گے۔ اور جو لوگ اپنوں سے نفرت کرتے ہیں۔ وہ خود بھی نفرت کے قابل ہوتے ہیں۔ دیکھو ناراض نہ ہونا۔ محمد سلطان خواجہ سے میرے تعلقات بھائیوں جیسے تھے۔ اسی لئے تم سے کہہ رہا ہوں۔ ورنہ گل محمد کے لڑکے ہوتے، تو زہر کا گھونٹ پی کر خاموش ہو جاتا۔

مجھے افسوس ہے کہ بلی نے ایسی بات کی۔

ارے بلی تو میری اپنی پوتی ہے۔ اُس سے مجھے کوئی گلہ نہیں۔ اور پھر بچوں سے کیسا گلہ؟ بڑے کی بات سنتے ہیں۔ تو وہی کہتے ہیں۔ بچے بندر ہیں، جو کرو اُس کی نقل اتارتے ہیں اللہ گواہ ہے میں نے گھر میں کبھی بچوں سے ایسی بات نہیں کی۔

اُف ہو! تم تو بار بار معذرت کرتے ہو۔ سنو جان کے رکھو۔ تم سے مجھے کوئی شکایت نہیں۔

شکایت نہیں بھی ہے اور ہے بھی۔ یہ بڈھا کتنا ڈپلومیٹک ہے!

اچھا ہٹاؤ، آؤ کوئی اور بات کریں۔ یہ بتاؤ تمہارے کاروبار کا کیا حال ہے؟

اللہ کا فضل ہے۔ اب تو تجارت کے ساتھ ساتھ چھوٹے موٹے ٹھیکے بھی لے لئے ہیں۔ خدا نے مہربانی کی تو ایک فیکٹری بھی کھولنے کا ارادہ ہے۔

کہاں؟

پہلے تو ارادہ یہیں بنانے کا تھا۔ لیکن یہاں زمین ملتی نہیں، اور پھر ملے گی بھی تو قیمت بہت زیادہ دینا پڑے گی۔ پتہ نہیں یہ اتنی بڑی دنیا لوگوں پر کیوں روز بروز تنگ ہوتی جا رہی ہے؟

آبادی بڑھ گئی ہے پہلے سے۔

نہیں نیت خراب ہو رہی ہے سب کی، لوگ زیادہ سے زیادہ پر قبضہ کر کے دوسروں کو مفلس اور قلاش بنانے کے درپے ہوئے ہیں۔ لوگ زیادہ سے زیادہ پیسہ کمانا چاہتے ہیں، زیادہ سے زیادہ جائیداد بنانا چاہتے ہیں۔ لیکن ایسے لوگ بہت کم ہیں، گنتی کے، پھر بھی یہ زمین سب پر تنگ کر رکھی ہے۔

کتنا باشعور ہے یہ بڈھا؟ کارل مارکس کا سالا!!

اللہ فضل نہ کرے اپنا، تو ایک دن یہی لوگ سب کے سب مارے جائیں گے۔ آخر کہاں تک اِن کی ہوس ان کا ساتھ دے سکے گی؟ آخر لوگ کہاں تک اپنی محرومیوں اور مفلسی کو برداشت کر سکیں گے؟ ہماری تاریخ میں ایسے دن کئی بار آئے ہیں۔ اللہ وہ...... طوائف الملوکی نہ دکھائے!

یہ بڈھا مذہب زدہ بھی ہے۔ لیکن کتنا صاف ذہن ہے اس کا!

کل مسجد میں ایک وعظ خواں آئے تھے۔ وہ آج کے زمانے کو تاریخ کے بدترین زمانے سے ملا رہے تھے، کہہ رہے تھے جتنی بے انصافیاں اور ناانصافیاں اس دور میں ہو رہی ہیں۔ وہ شاید ہی کبھی ہوئی ہوں۔ لوگ راہِ راست سے ہٹ کر ہوس، لالچ اور ظلم کی راہ پر چل رہے ہیں، اور ایک طوفان آنے والا ہے!

کیسا طوفان؟

ایک خدائی قہر!

ارے ہاں یاد آیا۔ وہ مسجد کی چھت تو بالکل بوسیدہ ہو رہی ہے۔ اس کی مرمت

کیوں نہیں کراتے آپ لوگ؟ کہیے تو میں کرادوں یہ کام؟

نمازی نہیں رہے۔ پھر مسجد کی چھت بوسیدہ نہ ہوگی، تو اور کیا ہوگا؟

یہ بڈھا میرے سیدھے سوال کا بھی الٹا جواب دے رہا ہے۔ میں اس پر اپنی مذہب پرستی کا رعب جمانا چاہتا ہوں۔ لیکن یہ زمانے کو رو رہا ہے۔ نمازیوں کو رو رہا ہے۔ کیسا بد بخت ہے!

میں چندہ کرا رہا ہوں، امید ہے سردیوں سے پہلے ہی مرمت ہوگی مسجد کی۔ اور پھر غسل خانوں کی حالت بھی بہت خراب ہے کہیے تو یہ کام میں اپنے ذمے لے لوں؟

تم؟

ہاں میں، پیسے کا غم نہیں، اللہ کا دیا بہت ہے۔

ارے تم کیوں خواہ مخواہ تکلیف کروگے؟ ہم نے پیسہ جمع کر دیا ہے۔ بس اب مسالہ ڈلوانے کی دیر ہے اور پھر مسجد تو خدا کا گھر ہے۔ اس کے بنانے میں سب کا حصہ ہونا چاہئے۔

کیا صفائی سے ٹال گیا۔ اب کیسے مطلب کی بات کروں اس سے؟

ارے یہ کورٹ کاہے کا ہے؟

بیڈمنٹن کا۔

پھر کوئی کھیلتا کیوں نہیں بیڈمنٹن؟

کیسے کھیلے کوئی بیڈمنٹن؟ بلی کورٹ میں اترے گی، تو تم لوگ کھڑکیوں میں جھول

جھول جاؤ گے۔ اور دیدے پھاڑ پھاڑ کر اسے بور کرو گے۔

کیوں بھئی کوئی کھیلتا کیوں نہیں ہے بیڈمنٹن؟

وہ ---- وہ بات یہ ہے کہ بچے ابھی تک امتحان کی تیاریوں میں لگے ہوئے ہیں۔ امتحان کے بعد فرصت ہوگی، تو کھیلیں گے اور پھر یہاں ہوا بھی بہت تیز چلتی ہے۔ اور شٹل کاک کسی دھڑے پر رہتی ہی نہیں۔

شٹل کاک؟ تمہارا مطلب چڑی سے ہے نا؟

ہاں۔

ارے ہاں ہوا تو یہاں بہت تیز چلتی ہے۔ تم نے کبھی کسی بیدزار میں جا کر دیکھا ہے کہ ہوا کیسے شاخوں میں سنتور بجاتی ہے؟

سنتور؟ وہ کیسے؟

ارے ہوا شاخوں میں داخل ہوتی ہے تو سنتور کے تار اپنے آپ بج اُٹھتے ہیں۔ اور ایسا دکھتا ہے، جیسے کوئی اُستاد کوئی مقام بجا رہا ہے۔ اچھا تم نے کبھی رات کو اُٹھ کر پریوں کا دَن دُن سنا ہے؟

پریوں کا دَن دُن۔ کہاں؟

وہ جو سلیمان کی چوٹی ہے نا؟ جہاں اب مندر ہے۔ وہاں سے ہی آواز آتی ہے۔ ہم تو انہیں پریاں کہتے ہیں، اور وہ جو سیبوں کے باغ میں پنڈت رہتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ اِندر پوری سے اپسرائیں آتی ہیں۔ اور شنکر جی مہاراج کے سامنے ناچتی گاتی ہیں۔

یہ بڈھا کتنا باتونی ہے؟ کہاں کی بات کہاں پہنچا دی؟

تمہارا کیا خیال ہے؟

میرا کوئی خیال نہیں، یہ سب کہنے کی باتیں ہیں۔ ورنہ کہاں ہوا سنطور بجا سکے گی؟ اور کہاں پریاں گا سکیں گی؟

ہاں یہ کہنے کی باتیں ہی ہیں، ہوں گی۔ لیکن ہمیں انہی باتوں سے بہت پیار ہے۔ ہم یہ باتیں ہزاروں سال سے سنتے آئے ہیں۔ تب سے جب سے ہمیں دیوی کے استھاپن سے دیش نکالا ملا تھا! ایک بات بتاؤں تم سے؟

کیا؟

ناراض تو نہیں ہو گے؟

نہیں!

تم لوگ......

یہ بڈھا رک کیوں گیا؟ کیا کہنے جا رہا ہے؟ اب تو میں اس سے ڈرنے بھی لگا ہوں! بھئی تم میرے عزیز ہو۔ اس لئے تمہیں کہنے میں کوئی حرج نہیں۔ میں نے ایک بار شہتوت کے پیڑ کے ساتھ انگور کی بیل لگا دی۔ بیل بڑھتے بڑھتے شہتوت کے پیڑ پر جا چڑھی۔ اس کی شاخوں سے جھولنے لگی۔ انگوروں کے گچھے، کانوں میں پڑے ہوئے آویزوں کی طرح جھولنے لگتے۔ تب میں نے دیکھا کہ دھیرے دھیرے شہتوت کا پیڑ کم فصل دے رہا ہے اور آخر نوبت یہاں تک آ پہنچی کہ چیونٹیوں نے اس کا گودا تک چاٹ لیا۔ اور ایک دِن آندھی میں یہ پیڑ ایسے گرا کہ جیسے کسی نوجواں پر چلتے چلتے اچانک بجلی گر جائے۔

یہ بڈھا کس بات کی طرف اشارہ کر رہا ہے؟ بڑا ظالم ہے!!

اور وہ انگور کی بیل زندہ تھی۔ اسے ہم نے نئے سہارے سے کھڑا کر دیا۔ وہ دیکھو اب بھی نظر آرہی ہے۔ اب بھی اس پر انگوروں کے گچھے نکلتے ہیں۔ لیکن مجھے بیل سے نفرت ہوگئی ہے۔

کیوں؟

کیوں کہ اس نے ایک جان لی، اور خود زندہ رہی۔

لیکن اس کہانی کا ہماری بات چیت سے واسطہ؟

یہی تو بتانے جا رہا تھا۔ یہ جو یہ نئے لوگ یہاں آکر بس گئے ہیں نا؟ مجھے انگور کی یہی بیل نظر آتے ہیں کیا؟

ارے تم نہیں بھئی۔ باقی لوگ۔ تم تو اپنے عزیز ہو۔ تمہارے مرحوم باپ کے ساتھ تو میرا بھائیوں جیسا رشتہ تھا۔

اے میرے مرحوم ابا کی روح! اس بڈھے کو رام کردے ورنہ میری یہ کوٹھی، اس کا یہ باغ، یہ ڈیوڑھی سب بیکار ہیں۔ اس نے زمین کا ٹکڑا نہ دیا تو سڑک کے ساتھ میرا رابطہ کبھی قائم نہ ہو سکے گا۔ میری گاڑی ہمیشہ سڑک پر رہے گی اور لوگ اس کے شیشے توڑتے رہیں گے۔ یہ مان جاتا، تو گیراج بھی بن جاتا اور ایک آؤٹ ہاؤس بھی۔ آؤٹ ہاؤس کرایے پر اُٹھ جاتا اور ہم مزے سے کوٹھی میں رہتے! اے میرے باپ کی روح! اپنا زور دکھا!!

تمہاری بلی کا کوئی قصور نہیں۔ گل محمد کے بچے بھی ہمارے بچوں کے سائے تک سے بھاگتے ہیں۔ یہ لوگ جو کل تک ہماری ہی طرح خاک میں لوٹ رہے تھے۔ زمانے کے اچانک پھیرے سے لکھ پتی بن گئے ہیں۔ یہ لوگ لکھ پتی بن کر زندہ رہنا چاہتے

ہیں۔ ماضی کو بھلا کر، اپنے لوگوں کو بھلا کر، اور اس لئے جب یہ لوگ ہمارے بچوں کو دھول اور مٹی میں لوٹا ہوا دیکھتے ہیں۔ تو ان کے دل کی دھڑکن رک جاتی ہے۔ انہیں اپنا بچپن یاد آتا ہے۔ جو اس سے کہیں زیادہ خراب تھا۔ یہ لوگ ہمارے سائے تک سے ڈرتے ہیں۔ کیوں کہ اس سے ان کا یہ احساس جاگتا ہے کہ کبھی یہ بھی ایسے ہی تھے۔ یہ لوگ اس احساس سے خوف زدہ ہو کر چاہتے ہیں کہ دنیا میں ہم جیسے لوگ مٹ ہی جائیں اور یہی رہیں۔ اس لئے کبھی یہ لوگ مسجد کی مرمت کرانا چاہتے ہیں۔

یہ کمینہ صاف میری طرف اشارہ کر رہا ہے۔

اور کبھی ہمیں اپنے گھروں کے برآمدے میں بٹھا کر میٹھی میٹھی باتیں سناتے ہیں۔

اُف یہ تو گود میں بیٹھ کر داڑھی نوچنے پر تلا ہوا ہے! نمک حرام!!

لیکن اب ہم سے حماقتیں نہ ہوں گی! اس علاقے کے لوگ اب ایک ایک انچ زمین کو چھاتی سے لگا کر رہیں گے۔ کیونکہ انہوں نے اس علاقے کی تاریخ بنائی ہے۔ یہ علاقہ اُن کی محنت اور جفاکشی سے وجود میں آیا ہے۔ یہاں اب دیوی کا غضب نہیں چلے گا۔ دیوی ہم سے بچھڑ گئی ہے اور اب ایک نیا خطرہ اُبھرا ہے۔ لیکن ہم نے اس خطرے کا سر کُچلنے کا فیصلہ کیا ہے یہ ہماری بچی بلی ہے نا؟

ہاں۔ وہی ہے!

دیکھو تو کس طرح نفرت سے مُنہ پھیر کر چل دی! ہاہاہا!!

اُف مجھے تمہاری اس منحوس ہنسی سے کتنا ڈر لگ رہا ہے! تم ہنستے ہو۔ تو تمہارا مُنہ ایک بوسیدہ قبر کی طرح کھل جاتا ہے۔ تمہاری آنکھیں جھریوں میں ایسے ڈوب جاتی ہیں،

جیسے کوئی سانپ من نگل جائے۔تمہارا سر ایسے ڈولنے لگتا ہے۔جیسے طوفان میں کوئی کشتی گھر جائے!تم موت ہو!موت کا سایہ ہو!

دیکھا کیسے بھاگ گئی؟ جیسے میں کوئی بھوت ہوں۔ اچھی تعلیم ملتی ہے کانونٹ میں!عجیب تہذیب لے کر آئے ہو تم لوگ یہاں!بزرگوں سے نفرت اور حقارت کا برتاؤ!!!

نادان بچی ہے۔جانے کیا سوچ کر چل دی!ورنہ۔

ورنہ کیا؟

بات یہ ہے کہ کانونٹ کی تعلیم کا اثر ہے۔کبھی کبھار ببلی مجھ سے بھی بے تکی باتیں کرنے لگتی ہے۔کل رات کو میں غلام محمد بٹ کی چھکری کا پروگرام ریڈیو سے سن رہا تھا۔ببلی آئی،اور ریڈیو کی سوئی گھما کر سیلون پر رکھ گئی۔ جہاں سے تازہ فلموں کے گیت سنائے جا رہے تھے۔لیکن کیا کروں مجبوری ہے۔دوسرے اسکولوں میں اچھی تعلیم ملتی نہیں۔کانونٹ میں صفائی رکھتے ہیں اور پڑھائی بھی اچھی ہوتی ہے۔

اور یہی تہذیب سکھاتے ہیں۔ہے نا؟

اس کا تہذیب سے واسطہ؟

عزیز من!تہذیب ایک دھارا ہے۔جو چھوٹی چھوٹی باتوں سے مل کر بن جاتا ہے۔اس میں اپنی تاریخ،اپنا ماضی اور اپنی روایات اور تمدن بھی شامل ہیں۔اور پھر ایک چیز ہے اخلاق سمجھے؟

میں اب تک صبر سے آپ کی باتیں سنتا رہا۔اب برداشت نہ ہوگا۔آپ کی باتوں سے نفرت کی بو آتی ہے۔

اس میں میرا کوئی قصور نہیں۔ یہ صرف تم لوگوں کے برتاؤ کی وجہ سے ہے۔

ہم سے پہلے بھی کچھ لوگوں نے یہاں زمین خریدی تھی۔ بنگلے بنوائے تھے۔ ان کی تاریخ کیوں بھول رہے ہیں آپ؟

ہاں۔ لیکن وہ ہمارے لوگ نہیں تھے۔ محمد سلطان خواجہ میرا دوست تھا۔ اللہ جنت نصیب کرے۔ اُس نے کبھی مجھے غیر نہیں سمجھا لیکن تمہارے بچے ہمارے بچوں کو غیر سمجھتے ہیں۔ تم ہمیں غیر سمجھتے ہو۔ حالانکہ ہماری زبان، ہمارا تمدن، ہماری تاریخ ایک ہے۔

میں نے آپ کو کبھی غیر نہیں جانا۔ ایسا ہوتا تو آپ میرے گھر کے برآمدے میں نہ ہوتے۔

جانتا ہوں کہ میں یہاں کیوں ہوں۔

کیوں ہیں آپ یہاں؟

اس لئے کہ......خیر ہٹاؤ۔

یہ بڈھا بات کرتے کرتے پھر کیوں رُک گیا؟ یہ کیا جانتا ہے؟

اچھا تمہارا بہت وقت ضائع کیا میں نے۔ جاتا ہوں۔ نئے نئے آئے ہو یہاں۔ کسی چیز کی ضرورت پڑے، تو نوکر کو بھیج کر ہمارے گھر سے منگوانا۔ یا آواز دے کر بلانا۔ تو ہمارے بچے دے آئیں گے۔

لیکن میں آپ سے ایک ضروری بات..........!

جانتا ہوں اُس بات کو بھی۔ لیکن تم تو میرے فیصلے سے پہلے ہی آگاہ ہو۔

میں منہ مانگے دام دوں گا!

اس کی ضرورت نہیں۔ تم لوگ ہر چیز کو پیسے کے ترازو میں تولتے ہو۔ اور تو اور انسان کی محبت، زمین سے اُس کا لگاؤ اور اپنے ماضی سے اس کی دل چسپی کو بھی۔ تمہاری کاروباری ذہنیت تمہیں لے ڈوبی۔ ورنہ میں تو گھر والوں سے فیصلہ کر کے نکلا تھا کہ زمین کا یہ ٹکڑا تمہیں مفت دے دوں گا۔ اپنے مرحوم دوست کے بیٹے کو ایک تحفہ! لیکن اب میں نے اپنا فیصلہ کر دیا ہے۔ میں جب تمہاری چائے پی رہا تھا، تو تمہاری آنکھیں مجھے سب کچھ بتا رہی تھیں۔ تم سوچ رہے تھے کہ بوڑھا کھوسٹ ہے پھنس جائے گا۔ چاندی کی چمک سے اس کی آنکھیں خیرہ ہوں گی اور زمین کا ٹکڑا میرے قبضے میں آجائے گا! اور چائے پیتے پیتے ہی میں نے فیصلہ بدل دیا!!

تو کیا آپ اس فیصلے کو پھر بدل نہیں سکتے ؟

نہیں!

لیکن آپ جا کیوں رہے ہیں؟ چلا گیا؟ کم بخت! نامعقول، نمک حرام بڈھا!۔ اب کیا ہوگا! میرا گیراج! میرا آؤٹ ہاؤس! ہُنہ!! بڑے خوددار بنے پھرتے ہیں یہ نالی کے کیڑے! تاریخ اور ماضی کے چکر میں رہتے ہیں! تھو ہے ایسے ماضی پر! اور تھو ہے ایسی تاریخ پر!! جو لوگوں کو باغی بناتی ہے! ہمارے منہ لگنے پر آمادہ کرتی ہے!! میرا بس چلے تو ان کے سارے ماضی اور تاریخ میں آگ لگا دوں۔ پھر کسی کو راکھ کے ڈھیر میں کوئی نشانی بھی نہ مل سکے!

نملی

حامدی کاشمیری

کمرے کی کھڑکی سے صبح کی تازہ دھوپ اندر آ کر سفید دیواروں پر تھرتھرا رہی تھی اور میں بیڈ پر تکیے سے ٹیک لگائے، ٹانگوں پر رضائی اوڑھے سگریٹ پی رہا تھا۔ کمرہ آج خالی خالی سا تھا۔ دیوار کے ساتھ لگا ہوا بیڈ خالی تھا۔ دیواریں ننگی تھیں۔ کل شام تک یہ کمرہ کتنا بھرا بھرا سا تھا۔ چیزوں سے اٹا ہوا۔ کچھ چیزیں قرینے سے تھیں اور کچھ بکھری بکھری سی۔ میلے کپڑے، صاف کپڑے، جوتے، سینڈل، ہینڈل بیگ، کھلونے، ربڑ کی ایک بڑی گڑیا بسکٹ کے ڈبے، کریم کی خالی شیشیاں، کاغذ کے پرزے، چھوٹا سا رنگین چھاتا، ربڑ کے بال، ابھی ابھی چیزوں کو سنبھال کر قرینے سے رکھا جاتا اور ابھی مسعود ایک ڈھیر سا لگا دیتا۔ ہر چیز کو اپنی جگہ سے ہٹاتا، تہس نہس کرتا، کمرے کو کباڑ خانہ بناتا اور پھر ممی کی ڈانٹ کھاتا۔ ڈانٹ کھا کر یا تو غصے میں چیزوں کو اور زیادہ الٹ پلٹ کرتا، یا چپکے سے کمرے سے باہر نکلتا اور نملی کے پاس جاتا اور ہم پھر کمرے کی تزئین میں لگ جاتے۔ لیکن آج سارا کمرہ لٹا لٹا سا لگ رہا تھا۔ ایک عجیب سی ویرانی کا احساس میرے دل کو کچوکے لگاتا رہا اور میں تیز تیز سگریٹ پیتا رہا۔

بیوی بچوں کے بغیر انسان کی زندگی کتنی اجاڑ اور بے معنی سی معلوم ہوتی ہے، آج کی صبح کتنی بے رنگ اور پھیکی پھیکی سی تھی شدت سے محسوس ہو رہا تھا کہ میں اپنے وطن سے دور ہوں، اپنے گھر سے دور۔

اتنے میں دروازے پر دستک ہوئی۔

میں دستک کو فوراً پہچان گیا، یہ نملی تھی۔ وہ اپنے ننھے ننھے ہاتھوں سے دروازہ

پیٹ رہی تھی میں چپ رہا، لیکن وہ برابر دروازہ کھٹکھٹاتی رہی۔ آخر تنگ آ کر میں نے روکھے سے لہجے میں کہا، انجان بن کر۔

''کون ہو؟''

''میں ہوں نملی کھولو درواجا ماشود''، نملی کی آواز بند دروازے کو چیر کر آ رہی تھی،

''مسعود یہاں نہیں ہے'' میں نے بستر میں بیٹھے بیٹھے ہی جواب دیا۔

''ہاں ماشود ہے۔ کھولو درواجا، وہ نیچے نی ہے''، نملی ضد کر رہی تھی، یہ اس کی عادت تھی اور میں بے چینی اور جھنجھلاہٹ سی محسوس کرنے لگا۔ میں نے زور سے کہا۔

''نملی تم چلی جاؤ، مسعود کل گھر گیا ہے۔ ممی کے ساتھ''

''ماشود نی گیا، ماشود اپنا گھر میں ہے۔ ماشود کھولو درواجا......''

نملی زور سے چیخ رہی تھی اور ساتھ ہی وہ دونوں ہاتھوں سے دروازہ پیٹ رہی تھی۔ میں اس کی ضد سے واقف تھا۔ روز صبح ہوتے ہی، جب کہ ابھی ہم بستر ہی پر پڑے ہوتے، وہ آ کر دروازہ کھٹکھٹاتی اور اس وقت تک برابر کھٹکھٹاتی جب تک میں بستر سے نکل کر دروازہ نہ کھولتا اور اگر مسعود کی آنکھ بھی تکرار اور سوال و جواب میں کُھل جاتی تو پلکوں پر نیند کے بوجھ کے باوجود وہ نملی کا ساتھ دیتا اور دروازہ نہ کھولنے پر احتجاج کرتا اور مجھے دروازہ کھولنے میں مزید تامل کی گنجائش نہ رہتی، میں دروازہ کھول دیتا۔ اور نملی سیدھے مسعود کے بیڈ پر آ جاتی اور وہ دونوں بہت شور مچاتے۔ ایک دوسرے کو گلے لگاتے......

''آہا ماشود''

''نملی، نملی''

مسعود فوراً امی سے بسکٹوں کا روزمرہ کا کوٹا حاصل کرتا اور نملی کے ساتھ مل کر کھاتا اور پھر دونوں کھیل میں مصروف ہوجاتے، شور مچاتے ایک دوسرے کے پیچھے دوڑتے۔ یہ اُن کا روزمرہ کا معمول تھا اور نملی دو مہینوں سے ہمارے کمرے میں آرہی تھی اور......

میں نے بستر سے نکل کر دروازہ کھول دیا تھا۔

اور نملی ایک نئے پھول دار فراک میں دھلے ہوئے منہ کے ساتھ کمرے کے اندر آئی، تالی بجاتی ہوئی،

وہ سیدھے دیوار کے ساتھ لگے بیڈ کی طرف گئی۔ لیکن چند قدم آگے جا کر رُک گئی۔

''کہاں ہے ماشوڈ'' ......؟ وہ کمرے کو بغور دیکھ رہی تھی۔

''میں نے کہانا، مسعود گھر گیا ہے۔ ممی کے ساتھ...... وہ کل گیا''

''نی نی یہ ماشود کا اپنا گھر ہے...... وہ کہاں ہے؟'' وہ احتجاج کرنے لگی اور میں نے ٹیبل سے ٹوتھ پیسٹ اٹھایا اور بُرش پر پھیلانے لگا۔

''ہاں ہاں'' اچانک وہ خوشی سے اچھل پڑی۔ ''تم نی کہتا وہ باتھ روم میں ہے ہمارا ماشود اور یہ کہہ کر وہ باتھ روم کے بند دروازے کو زور زور سے کھٹکھٹانے لگی۔

''وہ باتھ روم میں نہیں ہے۔ لو میں دروازہ کھولتا ہوں'' دروازہ کھل گیا۔ اور وہ بے تحاشہ اندر چلی گئی، میں اس کے ساتھ ہی کھڑا دانتوں پر برش پھیر رہا تھا۔

وہ پل بھر تک باتھ روم کو دیکھتی رہی۔ اس کا چھوٹا سا گول مٹول چہرہ اداس ہوگیا۔ اور وہ بڑبڑانے لگی۔

''ماشود نی ہے، وہ کہاں ہے؟'' وہ مڑی کمرے پر ایک اور نظر ڈال کر وہ کچھ سوچتی رہی۔ اچانک اس کا چہرہ کھل اٹھا۔ اور خوشی سے پکار اٹھی۔

"ہاں ہاں ماشود نیچے ہے......ابھی لاتی ہوں......" یہ کہہ کر وہ ہوا کے ایک تیز جھونکے کی طرح کمرے سے نکل گئی۔

میں نے دروازہ بند کیا۔اور باتھ روم میں داخل ہوا۔

میں ڈائنگ روم میں ٹیبل پر بیٹھا چائے پی رہا تھا۔تنہا، چپ چاپ مقبول نے چائے کا سامان لگایا تھا۔اور اب وہ کچن میں مصروف تھا۔کمرے میں خاموشی تھی۔ٹیبل پر آج دوسری پیالیاں اوندھے منہ رکابیوں پر پڑی تھیں میں نے جلدی سے پہلا کپ خالی کیا اور دوسرا کپ بنانے لگا۔آج چائے پینے میں کوئی لطف نہیں آرہا تھا۔آج پیالی میں بیوی چینی نہیں ڈال رہی تھی۔اور نہ ہی چمچے سے چینی گھول رہی تھی۔مسعود بھی وہاں نہیں تھا۔اور نہ ہی مسعود کے بغل میں نملی بیٹھی تھی۔سارے ہنگامے خاموش ہو چکے تھے۔مجھے پھر ایک بار شدت سے اپنے اکیلے پن کا احساس ہوا۔اگر میں کل ان کے ساتھ ہی گھر روانہ ہو گیا ہوتا۔تو کتنا اچھا ہوتا،لیکن......لیکن مجھے انشورنس کا کافی کام کرنا تھا اور اس مہینہ میں تمام امور کو طے کرنا چاہتا تھا۔تین مہینوں کے اس وقفہ میں دفتری امور سے نمٹنے کے علاوہ میں نے مسعود کو دلّی کے ایک معروف چائلڈ سپیشلسٹ کو دکھایا تھا۔اور اس کا باقاعدہ علاج کرایا تھا۔ڈاکٹر ورما نے مسعود کے علاج معالجے میں ہمدردی اور شفقت کا مظاہرہ کیا تھا۔ ہمارے شہر کے ہسپتال کے ڈاکٹروں کی رعونت سے اگر مریض کی حالت اور زیادہ خراب ہوتی ہے تو تعجب کی بات نہیں۔لیکن ڈاکٹر ورما کتنی توجہ سے اس کا معائنہ کرتے رہے......پچھلے سال مارچ......ہاں مارچ کا مہینہ ہی تو تھا۔وہ بیمار ہو گیا۔اور معمولی سے زکام نے رات کو دمہ کی شکل اختیار کی۔اور ساری رات اس کا سینہ دھونکنی کی طرح ہلتا رہا۔ کچھ دیر تک وہ میری گود میں رہا۔اور اس کے سینے کے ہلنے سے میرا سارا جسم ہل رہا تھا۔ایسا محسوس ہوتا تھا۔جیسے سارا مکان ہل رہا ہے۔کتنی طویل رات تھی۔پہاڑ کی طرح بھاری، نا معلوم اندیشے مجھے پریشان کر رہے تھے۔اور صبح کی نرم روشنی میں جب لان میں پھولوں کی

شاخوں نے انگڑائی لی اور غنچوں نے آنکھیں کھولیں تو اُسے قرار آیا۔ اور وہ گہری نیند سو گیا۔
اور پھر......؟ بیماری کا یہ حملہ ہر مہینہ ہوتا رہا۔ اور ڈاکٹروں نے دوائیں کھلا کھلا کر اس کی قوتِ
مدافعت کو ختم کر کے رکھ دیا۔ یہ ڈاکٹری علاج بھی کتنا Inexact ہوتا ہے۔ ہر ڈاکٹر
اپنی سمجھ اور علم کے مطابق نسخہ لکھ مارتا ہے اور ڈاکٹروں کے اپروچ میں کتنا فرق ہوتا ہے۔
مولیئر نے اپنے کسی ڈرامے میں خوب لکھا ہے۔ کہ انسان کی سب سے بڑی حماقت یہ ہے
کہ وہ انسان کا علاج کرتا ہے۔

مقبول آیا۔

''صاب شام کے ٹیم پر گوشت پا کانا ہے؟''

''جو تمہاری مرضی ......'' میں ٹیبل سے اٹھنا ہی چاہتا تھا کہ کچن سے ملحق دروازہ
کھل گیا اور نملی دوڑتی ہوئی اندر آئی۔ وہ سیدھی میرے سامنے آئی اور پوچھنے لگی۔

''ماشود کہاں ہے؟...... یہاں نی ہے، اوپر نی ہے۔ باغ میں نی ہے گیتا کے پاس
نی ہے.....وہ کہاں گیا؟''

میں نے غور سے اُسے دیکھا۔ اس کی ابھرے ابھرے پپوٹوں میں پھنسی ہوئی گول
گول چھوٹی چھوٹی آنکھیں بے چینی سے پھر رہی تھیں۔ اس کے غبارے کی طرح پھولے
ہوئے چھوٹے سے گول سانولے چہرے پر تردد تھا۔ جیسے اسے اب گمان ہو رہا تھا کہ مسعود
چلا گیا ہے...... بیچاری کو اپنے دوست کی جدائی شاق گزر رہی ہے۔ مسعود اطلاع دیئے بغیر
نامعلوم طریقے پر وہاں سے چل دیا تھا۔ اور نملی کا چھوٹا سا ذہن پریشان تھا۔ یہ مسعود صبح
سویرے پر لگا کر کہاں اڑ گیا؟ اس کی یہ پریشانی اور اضطراب دیکھ کر مجھے اپنے غم کا احساس
تیز ہوا۔ نملی تھوڑی دیر کے بعد گیتا اور دوسری ہمجولیوں کے ساتھ کھیلنے میں لگ جائے گی اور

مسعود کو بھول جائے گی۔ میں نے اسے پھر سمجھایا۔ لیکن وہ مجھے ساکت آنکھوں کے ساتھ تکتی رہی۔

مقبول ٹیبل صاف کر رہا تھا۔

اور میں اوپر کمرے میں کپڑے تبدیل کرنے کے لیے سیڑھیاں پھلانگنے لگا۔

میں شام کو واپس لوٹا۔ تھکا تھکا سا، آج مجھے کام کے سلسلہ میں ہیڈ آفس جانا پڑا تھا۔ چائے میں نے دفتر ہی میں پی لی تھی۔ کمرے میں پہنچتے ہی میں بستر پر لیٹ گیا۔ اتنے میں نملی آ گئی۔

''ماشود آیا؟'' وہ بڑی بے تکلفی سے میرے سرہانے کے قریب آئی اور لمحہ بھر کے بعد اس کی نظر تپائی پر پڑی جس پر میں نے بازار سے خریدا ہوا ٹوتھ پیسٹ، صابون کی ایک ٹکیہ اور بلیڈ کا ایک پیکٹ رکھا تھا۔ وہ ان چیزوں کو الٹنے پلٹنے لگی۔ اس نے اپنے ننھے ہاتھوں سے ٹوتھ پیسٹ کے ٹیوب کو کوور سے نکالا۔ کچھ سوچ کر اس نے اسے تپائی پر رکھ دیا۔ اور بلیڈ کے پیکٹ کو کھولنے کی سعی کرنے لگی۔ وہ اپنے آپ سے کہہ رہی تھی۔

''تم اچھا چیزیں لاتا ہے، ماشود کے لئے لاتا ہے نا، ہمالا پاپا نی لاتا، ممی لاتا ہے، ممی بہت اچھا ہے۔ ہمارے کو مارتا نہیں۔ پاپا مارتا ہے۔ تم ماشود کو نی مارتا۔ ماشود ہمالا ہے۔

نملی ...... نملی ......'' اتنے میں باہر سیڑھی سے نملی کی آیا کی آواز آئی ۔ وہ دروازے پر آ کر رک گئی۔ آٹھ نو سال کی لڑکی، سیاہ فام، سیاہ چشم، ڈھیلے ڈھالے فراک میں ملبوس۔

آؤ نملی پاپا بلاتے ہیں..... '' آیا کی برچھی کی طرح تیز آواز سنتے ہی نملی کچھ کہے بغیر اس کے پیچھے ہو لی۔

میں نملی کے پاپا کے بارے میں سوچنے لگا۔ مسٹر رمیش ان سے ہماری صرف ایک یا دو بار ملاقات ہوئی تھی، وہ ریلوے میں ملازم تھے اور زیادہ تر عدیم الفرصت ہی رہتے تھے۔ لمبے تڑنگے انسان، بند گلو کا شارٹ کوٹ پہنے، لمبی سی متحرک گردن، جس پر چھوٹا سا گول چہرہ یوں دکھائی دیتا، جیسے اس پر چپکا دیا گیا ہو۔ ان کی گول آنکھیں ان کے موٹے عینک میں ہمیشہ چھپی رہتیں، میرا مشاہدہ تھا کہ وہ ہم سے زیادہ ملنے جلنے کے روادار نہ تھے۔ ہم سے ملنے کے لئے انھیں کئی دیواروں کو پھاندنا تھا۔ مذہب، رنگ، زبان اور اجنبیت کی دیواریں۔ اور ایسا کرنے کے لئے شاید ان کے پاس ٹائم نہیں تھا۔ مسز رمیش البتہ کبھی کبھی ہمارے پاس آتیں۔ وہ نپی تلی باتیں کرتیں۔ مدھم مدھم خوابناک لہجے میں، ان کا سانولا رنگ نیلے یا سفید رنگ کی ساڑھی میں نکھر اٹھتا۔ سانولے رنگ کی خوبرو عورت......

صبح کو میں ابھی بستر ہی میں تھا کہ دروازے پر دستک ہوئی۔ میں فوراً پہچان گیا۔ یہ نملی ہے۔

''کھولو درواجا، ماشود، میں نملی ہوں......'' وہ زور زور سے کہہ رہی تھی میں چپ چاپ لیٹا رہا۔ مجھے اکتاہٹ سی ہوئی۔ یہ بچے بعض اوقات مصیبت بن جاتے ہیں۔

نملی دروازہ بجاتی رہی۔

میں چپ سادھے لیٹا رہا۔

''نملی......'' دفعتاً مسز رمیش کی آواز میرے کانوں تک آئی۔ وہ اوپر ہی آرہی تھیں۔

میں نے جھٹ رضائی پرے پھینک دی اور پاؤں میں چپل پہن کر دروازے کی طرف لپکا اور فوراً چٹخنی کھولی۔

نملی دوڑ کر اندر آ گئی۔ اس کے ہاتھ میں امرود تھا۔

''یہ ماشود کے لئے ہے۔ بٹی لایا ہے۔ ماشود کہاں ہے؟'' وہ پاگل کی طرح کمرے میں دیکھتی رہی۔ اور باہر مسز رمیش کی آواز نزدیک آرہی تھی۔

''نملی، دیکھو ماشود یہاں نہیں ہے......'' میں اس کے سامنے کھڑے ہو گیا۔

وہ مجھے کریدتی نظروں سے دیکھنے لگی۔

''تمہاری ممی بلاتی ہے نملی۔ دیکھو وہ آرہی ہے......''

''نی، وہ باجار گیا ہے

مسز رمیش دروازے پر آ کر رُک گئیں۔ انہوں نے نملی کو ڈانٹا،

''نملی چلو پاپا بلاتے ہیں۔ فوراً سے وہاں میری موجودگی کا احساس ہوا۔ اور اس نے مسکرا کر آداب کہا۔ اسکی مسکراہٹ بناوٹی تھی۔ نملی اس کے ساتھ گئی اور میں نے اطمینان کی سانس لی۔

نملی تیسرے دن بھی صبح سویرے آئی۔

وہ چوتھے دن بھی آئی۔

اور برابر آٹھ دن تک آتی رہی۔

اس کے بعد وہ نہیں آئی۔ میں آفیشل ورک میں جٹا رہا۔ دن رات تیزی سے گزرتے رہے۔ اور دیکھتے دیکھتے پچیس دن بیت گئے ایک رات خاصی گرمی پڑ رہی تھی۔ مجھے نیند نہیں آ رہی تھی۔ اور میں غیر ارادی طور پر نملی اور مسعود کے بارے میں سوچتا رہا۔ نملی صبح سویرے دروازے کھٹکھٹاتی ہے اور زور زور سے پکارتی ہے۔

''ماشود کھولو درواجا، میں نملی ہوں'' اور پھر وہ اندر آ جاتی ہے اور مسعود پلکوں پر

نیند کا اڑتا ہوا غبار لے کر اس کی پیشوائی کے لئے آگے بڑھتا ہے اور وہ دونوں ایک دوسرے کو گلے لگاتے ہیں۔

''آہا ماشود''

''نملی، نملی''

اور دونوں ننھے ننھے ہاتھوں سے تالیاں بجاتے ہیں۔

مسعود اسے بسکٹ کھلاتا ہے۔ اور نملی کبھی کچے ٹماٹر یا کبھی امرود لے آتی ہے اور دونوں مزے سے کھاتے ہیں۔

......وہ دونوں مسعود کے پلنگ پر، جس پر مسعود کا بستر بچھا ہوا ہے بیٹھ جاتے ہیں۔ اور نملی مسعود کو کہتی ہے۔ ''ماشود، ہمالا ممی ٹرے سیکل لائے گا۔ ہم تم کو دے گا ماشود......'' یہ کہکر وہ زور سے ہنستی ہے۔ مسعود کہتا ہے۔ ''ہمارے گھر میں، ادھر ٹرے سیکل ہے۔ وہ میں چلاتا ہوں۔ وہ میرا ٹرے سیکل ہے سب کو بٹھاتا ہوں ......ٹی ٹی......ٹی ٹی......'' جیسے سچ مچ ٹرے سیکل چلانے لگتا ہے۔

''ہم کونی بٹھاتا ماشود؟'' نملی روٹھتی ہے۔

''ہاں، تم کو بٹھائے گا......'' نملی خوش ہو کر تالی بجاتی ہے۔

وہ دونوں ہنس پڑتے ہیں۔ اور شور مچاتے ہیں۔

اتنے میں نملی کی نظر مسعود کی چھوٹی سرخ رنگ کی شنیل کی رضائی پر پڑتی ہے۔

''یہ کس کا ہے ماشود؟''

مسعود ٹکر ٹکر اُسے دیکھتا ہے۔

''یہ ماشود کا نی ہے''

''کس کا ہے؟''

''یہ راج کمار کا ہے، تم راجکمار ہے ماشود، گورا گورا......اور میں مہارانی ہوں......'' ''تم مہارانی''، مسعود خوش ہو کے کہتا ہے'' اور میں راج کمار'' دونوں قہقہے لگاتے ہیں۔

اور میں بیوی کی طرف دیکھتا ہوں۔ ہم دونوں مسکرا کے رہ جاتے ہیں......نملی مسعود سے روٹھی ہوئی ہے۔ مسعود کے ہاتھ میں دو ٹافیاں ہیں نملی ٹافی لینے سے انکار کرتی ہے۔ منہ سے کچھ نہیں کہتی۔ صرف سر ہلاتی ہے۔

انکار میں، مسعود روہانسا ہو گیا ہے۔ مجبور ہو کر اس نے مجھ سے رجوع کیا ہے

''ڈیڈی، نملی ٹافی نہیں کھاتی......''

''کیوں نہیں کھاتی، نملی لو نا ٹافی، مسعود نے تمہارے لئے رکھی ہے''

''ہم نی لے گا''۔ وہ مسعود کی طرف پیٹھ کر کے بولتی ہے۔

''کیوں؟'' میری دلچسپی بڑھ جاتی ہے۔

''ماشود گیتا سے کھیلتا ہے''

مسعود تعجب سے کبھی نملی کو دیکھتا ہے اور کبھی مجھ کو، ''کھیلتا تو ہے''

''ہم نے گیتا کو گھر سے نکال دیا......''

کیوں؟''

اس نے ہمالا گڑیا چھوری کیا،

ہاں وہ چھور ہے......"

چور...... گیتا چور ہے۔ "مسعود پکار اٹھتا ہے اور نملی اس کے ہاتھ سے ٹافی چھین کر منہ میں رکھ لیتی ہے۔

اتوار کو مسعود نملی کے گھر سے بھاگ آتا ہے اور سیدھے میری گود میں آ بیٹھتا ہے۔ اس کا چہرہ اترا ہوا ہے۔

"کیوں بیٹے کیا بات ہے؟"

"ڈیڈی، میں مسعود ہوں نا؟"

"ہاں تو اس میں کیا شک ہے؟"

"لیکن نملی کا پاپا ہے نا؟"

ہاں ہے تو......

"وہ کہتا ہے۔ تم مسلمان ہو۔ مسلمان کیا ہوتا ہے؟

"اچھا تو تم نے کیا کہا؟

میں نے کہا میں تو مسعود ہوں۔

"تم نے ٹھیک کہا بیٹے۔"

"وہ نملی کو میرے ساتھ کھیلنے نہیں دیتے"۔ وہ روہانسا ہو گیا۔

سوموار کو میری بیوی اور مسعود آ رہے تھے مجھے آج ہی ان کا خط ملا تھا۔ بیوی نے لکھا تھا کہ مسعود کی صحت پہلے سے بہت بہتر ہے۔ اُسے بھوک بھی لگتی ہے۔ نملی کو وہ اب بھول چکا تھا۔ گھر پہنچنے سے پہلے دو تین دنوں تک وہ نملی کو بہت یاد کرتا رہا۔ صبح شام نملی کا

ذکر، اُسے گیتا بھی یاد آتی رہی۔ لیکن اب وہ دلی کے سب دوستوں کو بھول چکا تھا...... ادھر نملی بھی اب اسے بھول چکی تھی۔ وہ بھول کر بھی اب ہمارے فلیٹ میں نہ آتی۔ اور نہ ہی اس دوران میں نے مسز رمیش کی ایک جھلک دیکھی تھی۔ بٹ بھی غائب تھی۔ یہ لوگ کہاں تھے مجھے معلوم نہ تھا۔

میں رات کا کھانا کھا رہا تھا۔ مقبول نے سبزی پکائی تھی وہ میرے سامنے ہی کھڑا تھا۔

''مقبول؛''

''ہاں جی......''

''یہ نملی کہاں غائب ہوگئی۔ نظر نہیں آتی۔''

''پتہ نہیں صاب''

''مسز رمیش کہاں ہے؟''

''گھر میں ہے''

''لیکن......''

''ان کے گھر میں ڈاکٹر آیا تھا......''

''کب؟''

''آج شام کو، کل بھی میں نے دیکھا تھا۔ ان کے کمرے سے ڈاکٹر نکل رہا تھا''

''پتہ نہیں کون بیمار ہے؟ شاید مسز رمیش......''

''وہ تو بھلی چنگی ہے۔''

''ہونہ ہو مسٹر رمیش نا ٹھیک ہوں گے''

''میرا بھی یہی خیال ہے''

''لیکن انہوں نے ہم سے کہا تک نہیں۔''

''یہ نہیں کہتے، مسٹر رمیش نے منع کیا ہے، بٹی کہتی تھی۔ پاپا بہت ڈانٹتے ہیں سبھوں کو، نملی کو زور سے پیٹا ہمارے یہاں آنے پر......''

''عجیب آدمی ہیں وہ تو......''

''مسز رمیش بھی اسی لئے ہمارے پاس نہیں آتی۔ ڈرتی ہے بیچاری......''

''اچھا تو یہ بات ہے، خیر چھوڑو۔ وہ نہیں آتے ہیں تو نہ سہی۔''

میں نے ٹھنڈے پانی کا گلاس خالی کیا۔ اور سنک میں ہاتھ صاف کرنے کے لئے کھڑا ہوا۔

مقبول نے آج میرے کمرے کی خوب صفائی کی تھی۔ چیزوں کو ٹھیک سے رکھا تھا۔ میں سات بجے کے قریب آیا تھا اور کمرے کی صفائی اور سجاوٹ دیکھ کر خوش ہوا۔ کوٹ میں نے ہنگر پر ٹانگ دیا۔ اور آج کا اخبار دیکھ رہا تھا۔ اتنے میں دروازے پر دستک ہوئی۔

میں نے جھٹ سے دروازہ کھولا۔

سامنے مسز رمیش تھی۔ میلی سی ساڑی میں ملبوس، بال اُلجھے اُلجھے سے، اترے ہوئے چہرے پر رات کی تاریکی۔ اور آنکھوں میں لرزتے آنسو......

''آپ؟ خیریت تو ہے؟

''نملی بیمار ہے......''

''نملی بیمار ہے۔؟ کب بیمار ہوئی......''

''وہ دس بارہ دن سے بیمار ہے، اور آج......وہ......''

''لیکن آپ رو کیوں رہی ہیں۔؟''

''وہ بے ہوش ہو گئی......''

''بے ہوش ہو گئی؟......'' ڈاکٹر کو نہیں بلایا؟''

''گھر میں کوئی نہیں ہے؟''

میں مسز رمیش کے ساتھ نیچے ان کے کمرے میں دوڑتا ہوا گیا۔ نملی پلنگ پر پڑی تھی۔ آنکھیں بند کئے ہوئے۔ وہ گلے تک ایک سفید چادر میں ڈھکی ہوئی تھی۔ اُف......، یہ نملی کی کیا حالت ہو گئی تھی اس کی آنکھیں اندر کو دھنس گئی تھیں۔ آنکھوں کے نیچے گہرے سیاہ دائرے تھے، بجلی کی مدھم روشنی میں اس کا چہرہ بے حد پیلا دکھائی دے رہا تھا،

''نملی ......نملی دیکھوں بیٹا نملی ......'' وہ اب بھی بے ہوش پڑی تھی میں نے اس کی نبض دیکھی، نبض تیز چل رہی تھی۔

''اچھا میں ڈاکٹر کو بلاتا ہوں......''

ڈاکٹر نے دوا تجویز کی اور فوری طور پر نملی کو ایک انجکشن لگوایا۔ اور تب کہیں اس نے پلکیں کھولیں مجھے اپنے سرہانے دیکھ کر اس نے میری طرف ٹکٹکی باندھ کر دیکھا۔ اور برابر پلکیں جھپکاتی رہی۔

''نملی نملی، دیکھو بیٹا......'' میں اسے پیار سے کہتا رہا۔

نملی نے آنکھیں کھولیں۔ تو مسز رمیش اپنے جذبات پر قابو نہ رکھ سکی۔ اس کی آنکھوں سے آنسوؤں کی دھار بہہ نکلی۔ اور اس نے نملی کے تپتے ماتھے کو چوما۔

اور نملی کے پپڑی جمے سیاہ ہونٹوں پر ہلکی سے لرزش پیدا ہوئی وہ ہڈیوں کا ایک مختصر سا ڈھانچہ بن کر رہ گئی تھی۔

معاً اس کی بے جان سے آنکھوں میں ہلکی سی چمک آئی

"ما......شو......د آ گیا؟"

"ہاں بیٹی مسعود آ گیا ہے۔" میں نے اسے پچکارتے ہوئے کہا۔

مجھے دیکھ کر اسے فوراً مسعود کی یاد آ گئی تھی۔

جلدی ہی اس کی پلکیں جھپکنے لگیں۔ انجکشن اور دوا نے اپنی تاثیر دکھائی ڈاکٹر کہہ گیا تھا کہ نملی ہوش میں آتے ہی سو جائے گی۔

"بھابی کب آ رہی ہیں؟" مسز رمیش کے لہجے میں بیچارگی تھی۔

"کل آ رہی ہیں"

"اچھا؟ ماشود بھی آ رہا ہے نا؟"

"ہاں ہاں۔ اُسے پھر ڈاکٹری معائنہ کرانا ہے۔"

"نملی ماشود کو بہت یاد کرتی ہے......" ماشود نام اس کی زبان سے اترتا ہی نہیں ......ہم نے کہا وہ گھر گیا ہے۔ تو بہت روتی رہی۔ کھانا پینا چھوڑ دیا۔ پاپا نے بہت ڈانٹ بتائی۔ لیکن یہ روتی رہی۔ اور چند دنوں سے رات کا کھانا نہیں کھایا۔ صرف ماشود کہتی رہی۔ پاپا نے تھپڑ مارا، اور رات کو بخار آیا۔ اور پھر اس رات سے بخار اترتا ہی نہیں......۱۰۲ ڈگری فیور رہتا ہے۔"

''اچھاتو یہ بات ہے؟'' مجھے ایسا محسوس ہو رہا تھا۔ جیسے میرے پاؤں تلے زمین نکل رہی ہے۔ اور سارا کمرہ گھوم رہا ہے۔

دوسرے دن میں دس بجے سٹیشن سے بیوی اور مسعود کو لے کر آیا کمرے میں سامان وغیرہ رکھوا کر میں مسعود کا ہاتھ پکڑ کر اسے سیدھے نملی کے پاس لے گیا۔ بیوی کمرے میں سامان وغیرہ درست کرنے لگی۔ نملی کے سرہانے مسز رمیش بیٹھی تھی۔ ہاتھ میں دوا کا چمچہ لئے ہوئے نملی پینے سے انکار کر رہی تھی۔

نملی ...... نملی دیکھو مسعود آ گیا ہے...... '' میں اس کے سرہانے بولا

نملی نے میری طرف دیکھا اور پھر مسعود کو دیکھا۔ معاً اس کے سیاہی مائل زرد چہرے پر ایک خفیف چمک سی آئی۔ جیسے راکھ کے ڈھیر میں چنگاریاں سلگ اٹھی ہوں۔''

☆☆☆

درد کا مارا

پشکر ناتھ

جب لڑکی تیسری بار اس کی دکان کے سامنے سے گزر گئی تو صمد جو نے حقے کی نے منہ سے نکال کر اس چیتے کے بچے کی طرف دیکھا جو دکان کے اندر اخروٹ کی لکڑی کی منقش تپائی پر کھڑا جیسے اپنی ماں کا انتظار کر رہا تھا۔ صمد جو کے ہونٹوں پر ایک من موہنی سی مسکراہٹ پھیل گئی اور پھر رفتہ رفتہ یہ مسکراہٹ ایک اداس سی کیفیت میں تبدیل ہوگئی۔ اداسی کا یہ مہین سا سفید دوپٹہ اس کے وجود پر لہراتا رہا اور آہستہ آہستہ اس کے وجود کو ڈھکنے لگا۔ جیسے جنوری کی یخ بستہ راتوں میں برف کے گالے دھیرے دھیرے درختوں کو ڈھک دیتے ہیں۔

بنڈ پر صمد جو کی دکان اس زمانے سے تھی، جب موجودہ ایمپوریم کی شاندار عمارت میں انگریز ریذیڈنٹ رہا کرتا تھا اور جب شام کو انگریز مرد اور عورتیں بنڈ کی سیر کیا کرتے تھے اور سرینگر کلب میں رات گئے تک فوکس ٹراٹ اور والٹز کی دھنیں سنائی دیتی تھیں، اس زمانے میں بھی صمد اینڈ سنز، فریئرس اینڈ ٹیکسی ڈرمسٹ کی دکان مشہور تھی اور انگریز عورتیں اس دکان میں سمور کے ملبوسات کی آرڈر بک پر بہت چاؤ کے ساتھ دستخط کیا کرتی تھیں۔ انگریز مرد تو صمد جو سے جانور اور پرندے بہت شوق سے خریدا کرتے تھے۔ چیتے، بارہ سنگھے، مارخور اور طرح طرح کے پرندے، ہوکرسر کی مرغابیاں، ولر کے راج ہنس، ڈل جھیل کی رام چڑیا، مانس بل کی بطخیں۔ مردہ جانوروں کی کھالوں میں نیا فٹ کرنے کا فن صمد جو نے اپنے باپ رمضان جو سے سیکھا تھا۔

رمضان جوان پڑھ تھا، لیکن خدا نے اُس کے ہاتھوں میں ایسا جادو بھر دیا تھا کہ

لوگ حیرت سے دانتوں تلے انگلیاں دبانے پر مجبور ہو جاتے تھے اور لوگ بھی کون؟ انگریز جو والیانِ ملک تھے اور سات سمندر پار سے تعلیم، علاج، دوائیاں، چاندی کے سکے اور مکارانہ نظام حکومت لائے تھے۔ کہا جاتا ہے کہ ایک انگریز کپتان نے خوش ہو کر رمضان جو کو ایک دستخطی سرٹیفکیٹ دیا تھا، جس میں لکھا تھا اگر رمضان جو لندن میں ہوتا تو بلاشبہ بادشاہ جارج ششم نے اس کا آرٹ دیکھ کر اس کو سر کا خطاب عنایت فرمایا ہوتا۔ افسوس کہ یہ سرٹیفکٹ اس آگ کی نذر ہو گیا تھا جس نے ایک منحوس رات کو رمضان جو کے مکان کو چشم زدن میں راکھ کا ڈھیر بنا دیا تھا۔ اس وقت صمد جو کی عمر اٹھارہ برس کی تھی اور دوسری جنگ عظیم ختم ہو گئی تھی۔ اس آگ نے صمد جو کے باپ کی کمر ہی توڑ دی اور ساتھ میں حاجی اسمٰعیل کی کمر بھی توڑ دی تھی، کیونکہ رمضان جو حاجی اسماعیل کا چہیتا کاریگر تھا۔

بہر حال رمضان جو نے اپنے بیٹے صمد جو کو اس ہنر کے تمام اسرار و رموز سکھائے تھے اور صمد جو نے آگے چل کر اپنے باپ اور اُستاد کا نام روشن کیا۔ بنڈ کے دوکاندار حلقوں میں بات مشہور تھی کہ ایک دن صمد جو کے ہاتھ سے بنا ہوا سنہری کلغی والا جنگلی مرغ دیکھ کر ایک انگریز کرنل کی جوان لڑکی نے چٹاخ سے اس کے کھردرے، میلے کچیلے ہاتھوں کو بوسہ دیا تھا۔ صمد جو اور زیادہ دنوں تک حاجی اسمٰعیل کا کاریگر بن کر نہ رہ سکا۔ کیونکہ چیزوں کے دام ایک دم بڑھ گئے تھے اور اس کا آبائی مکان جل چکا تھا اور گیلی لکڑی کے کڑوے کسیلے دھوئیں سے اس کی ماں کو شاہی بیماری لگ گئی تھی۔ ڈاکٹر رالنس کی فیس بلہ کاک در اور احمد شہداد جیسے رئیس ہی ادا کر سکتے تھے۔ صمد جو مال بنا کر پہلے تو مختلف دکانداروں کو دیتا رہا پھر گگری بل کے ہاؤس بوٹوں میں رہنے والے انگریزوں کو بیچتا رہا۔ پھر ملک آزاد ہونے سے پہلے گورڈن صاحب نے بنڈ پر اپنی سگار اینڈ کینڈی نامی دکان بڑھا کر ولایت واپس چلے جانے کی ٹھان لی۔ اتفاق سے یہ خالی دکان صمد جو کو مل گئی۔ پانچ چھ مہینوں کے بعد اس دکان

پر بورڈ لگ گیا۔ صمد اینڈ سنز، ٹیکسی ڈرمسٹ اور یہ بورڈ اتنا مشہور ہوا کہ ابھی تک ولایت سے آنے والے سیاح سرینگر میں اس بورڈ کو تلاش کرتے نظر آتے ہیں۔

کچھ صمد جو کی فنکارانہ مہارت کا کرشمہ تھا کچھ اس کی انتھک محنت کا نتیجہ تھا اور کچھ اس کی سادگی پسند طبیعت کا اثر تھا کہ صمد اینڈ سنز کی دکان چل نکلی۔ بنڈ کی بڑی دکانیں اس کی روشنی کی چکاچوند سے ماند نظر آنے لگیں۔ تھوڑے عرصے کے بعد صمد صاحب حیثیت اور صاحب جائیداد تاجروں میں شمار کیا جانے لگا۔

صمد جو نے اٹھ کر دکان کے اندر اخروٹ کی منقش تپائی پر رکھے ہوئے چیتے کے بچے کی پیٹھ پر پیار سے ہاتھ پھیرا، پھر شیشے کی بنی ہوئی ان آنکھوں کی طرف دیکھا جو اس نے نہایت فنکاری کے ساتھ اس کے چہرے میں فٹ کی تھیں۔ پھر اس کے منہ پر لگائے ہوئے ان بالوں کو دیکھا، جو ایک ایک کر کے بہت احتیاط کے ساتھ اس نے پندرہ دن میں لگائے تھے۔ پھر انگلی سے اس کے منہ کے اندر لگائے ہوئے چھوٹے چھوٹے تیز نوکیلے دانتوں کو چھو کر دیکھا۔ وہاں واقعی چند قدم کی دوری پر ہر دیکھنے والے کو چیتے کا یہ بچہ ایسے نظر آئے گا، جیسے ابھی یہ اپنا داہنا پنجہ آگے بڑھائے گا اور جست لگا کر اس اخروٹ کی تپائی سے کود پڑے گا۔

اس لڑکی کو بھی دکان کے باہر ایسا ہی نظر آیا ہوگا، جب ہی تو وہ دکان میں داخل ہو کر بے حد محتاط انداز میں، ڈرتے جھجکتے اس تپائی کے پاس چلی گئی تھی اور پھر اس کے منہ سے ایک عجیب آواز نکلی تھی جو نہ چیخ تھی، نہ کلمۂ حیرت تھا، نہ اظہارِ انبساط تھا۔ ایک عجیب سی آواز تھی جو شاید ہر بچے کے منہ سے نکلتی ہے جب وہ پہلی بار سورج کو طلوع ہوتے دیکھتا ہے۔

پھر اس لڑکی نے ڈرتے جھجکتے صمد جو سے پوچھا تھا کہ بیچنے کے لئے ہے یا دکان کی ڈیکوریشن کیلئے اور صمد جو نے منقش چم چماتے ہوئے پیتل کے حقے کی نے مُنہ سے نکال کر کہا تھا، بیچنے کے لیے۔

پھر لڑکی نے اس کی قیمت پوچھی تھی، تو صمد جو قیمت بتادی تھی، دو ہزار سات سو اسی روپے! قیمت سن کر لڑکی نے کوئی جواب نہ دیا تھا۔ صرف ایک جھجک کے ساتھ اس چیتے کے بچے کی کمر پر ہاتھ پھیرا اور دکان سے باہر چلی گئی تھی۔

یہ کوئی گیارہ بجے کے قریب کی بات تھی۔ دو بجے دن کے وقت جب صمد جو دکان کے اندرونی حصے میں کھانا کھانے کی غرض سے جانے کی سوچ رہا تھا، تو یہ لڑکی پھر دکان کے سامنے کھڑی ہوگئی تھی اور چند لمحوں تک ٹکٹکی باندھے چیتے کے بچے کی طرف دیکھ کر، بجھے ہوئے قدموں سے آگے نکل گئی تھی اور ابھی تھوڑی دیر پہلے یہ لڑکی تیسری بار دکان کے سامنے سے گزر گئی تھی اور اس کی نظریں اس چیتے کے بچے پر جم کر رہ گئی تھیں، اس کے لب تھرتھرائے تھے لیکن کوئی آواز سنائی نہ دیتی تھی۔

چیتے کے بچے کے بالوں میں بے خیالی سے انگلیاں پھیرتے پھیرتے صمد جو کو ان تھرتھراتے ہونٹوں کا خیال آیا اور پھر خیالوں کی یہ رو وقت کے پردوں کو چیرتی ہوئی دور پیچھے چلی گئی۔ جب وہ اٹھارہ انیس برس کا نوجوان تھا اور جب اس کا آبائی مکان آگ کی نذر ہو کر خاکستر ہو گیا تھا، ان دنوں ہر خوبصورت مکان دیکھ کر اس کے ہونٹ اسی طرح غیر ارادی طور پر تھرتھرایا کرتے تھے یا جب اس نے پہلی بار ایک دودھیا رنگ کی شیورلیٹ کار دیکھی تھی۔ یا جب اس نے پلیڈیم ٹاکیز میں پہلی بار سلوچنا چیٹر جی کو کسی فلم میں دیکھا تھا۔ کیسی تھرتھراہٹ تھی اس میں؟ کیوں ان موقعوں پر اس کے ہونٹ تھرتھراتے تھے؟ آج اتنے سال گزر جانے کے بعد صمد جو اپنے ہونٹوں کی اس بے آواز تھرتھراہٹ کے معنی نہیں کھوج سکا۔ زمانہ بیت گیا تھا تب سے آج تک مگھرمل باغ میں صمد جو کا شاندار مکان تھا۔ اس کے گیرج میں دو موٹریں موجود تھیں۔ وہ ہر اتوار کو اپنے دونوں پوتوں ریاض اور اعجاز کو گگری بل میں گھنٹوں موٹر بوٹ کی سیر کراتا تھا، انہیں کبھی خیام میں، کبھی فردوس میں فلم دکھا

نے لے جاتا تھا اور ان کے معصوم سرخ لبوں کی طرف دیکھتا رہتا تھا کہیں کسی بے آواز تھر تھراہٹ کا سایہ تو نہیں ہے۔

اس کا دل اب بھی کبھی کبھی پلیڈیم ٹاکیز میں فلم دیکھنے کے لیے مچلتا تھا مگر اب اپنی اس چاہت کو وہ ایک جہاندیدہ مسکراہٹ میں ٹال دیتا تھا۔ اب وہ اٹھارہ انیس کا صمد نہیں تھا۔ ستاون اٹھاون برس کا باوقار بزرگ تھا حاجی صمد جو نماز وروزے کا پابند۔

اس نے آخری بار چیتے کے بچے کی پیٹھ پر ہاتھ پھیرا اور آ کر اپنی گدّی پر بیٹھ گیا۔ اس چیتے کے بچے کو اس نے پچھلے سال اپنے ہاتھوں سے تیار کیا تھا حالانکہ یہ کام اب کے دوسرے کاریگر اور ملازم کیا کرتے تھے مگر نہ جانے کون سا لمحہ تھا وہ جب اس چھوٹی سی کھال کو دیکھ کر اس کے اندر چھپا ہوا فنکار جاگ پڑا تھا..........اور..........آج یہ لڑکی جواب تک تین بار اس کی دکان کے چکر لگا چکی تھی، اس کے فن کے آگے ہوش وحواس کھو بیٹھی تھی۔

صمد جو نے حقے کی نَے ہونٹوں میں دبائی اور ہلکے ہلکے دھوئیں کے سائے میں اس لڑکی کے بارے میں سوچنے لگا۔ دھان پان جسم، کمر کے نیچے تک لمبے بالوں کی دو چوٹیاں اٹھارہ انیس برس کی لگتی تھی۔ ہاں! اس عمر میں کوئی حیران کن چیز دیکھ کر ہونٹ تھرتھراتے ہیں اور آواز نہیں نکلتی۔ بالکل جیسے اس عمر میں اس کے ساتھ ہوا کرتا تھا۔ بے چاری معصوم لڑکی! چاند کو ہتھیلی پر اتارنے کی تمنا۔ مگر جب ایک معمولی آئینہ بھی پاس نہ ہو، تو چاند کتنا دور لگتا ہے۔ نگاہ سے دور، دسترس سے دور، مگر خیالوں کے پاس! ہونٹوں کی بے آواز تھرتھراہٹ کے اریب قریب!

سوچتے سوچتے اچانک صمد جو کو خیال آیا کہ شاید اس لڑکی کے پاس اتنے پیسے ہی نہ ہوں کہ وہ اپنے خیالوں کے اس چاند کو خرید سکے۔ کتنا عجیب سا لگتا ہے جب دل ایک

طرف کھینچتا ہو، مگر جیب دوسری جانب گھسیٹ کرلے جاتی ہو۔محرومی؟ لاچاری؟ مجبوری؟ آدمی کا اپنے آپ پر اعتبار ہی اٹھ جاتا ہے۔ یہ بہت بڑا گناہ ہے۔

صمد جو نے سامنے پڑی ہوئی پنسل اور کاغذ کا سہارا لیا۔ وہ حساب لگانے لگا۔ منافع نکال دو۔ بہت کچھ دے رکھا ہے اللہ پاک نے۔ محنت کی اجرت بھی نفی کرو۔ سب اسی رب جلیل کا فضل ہے۔ صرف لاگت کا حساب، کھال کی قیمت، دوسری چیزوں کی قیمت جو استعمال کی گئی تھیں، بس۔ کل سترہ سو اسی روپے۔

اس پتلی سی لڑکی کا دل، جو نہ جانے ملک کے کس حصے سے شاید پہلی بار کشمیر کی سیر کو آئی تھی، اسے جب بھی کشمیر کی یاد آئے گی، تو چیتے کا بچہ اس کی یادوں کے طاق پر ہمیشہ زقند بھرنے کے لیے تیار نظر آئے گا۔ اسی لمحے وہ لڑکی پھر دکان کے اندر داخل ہوگئی۔ کیا کروں، یہ ٹائیگر کب (Tiger Cub) ہم کو بہت لائیک کیا۔ پیسہ جاستی ہے۔ اپن کے پاس اتنا پیسہ نہیں ہے۔ بہت خرچہ ہے ادھر کاسمیر میں۔ کیا کروں، یہ ٹائیگر کب ہم کو ایک دم بِکل کر دیا۔ ہائے!

صمد جو کے چہرے پر ایک البیلی سی مسکراہٹ کھل اٹھی: ”معلوم ہے بی بی۔ سب سمجھ گیا ہوں۔ پر کوئی بات نہیں۔ ہم تم کو یہ ٹائیگر اب بالکل کاسٹ پرائس پر دے گا۔ ہم نے حساب لگایا ہے۔ خالی میٹیریل کا کاسٹ.......... سمجھ گئی نا.......... خالی سترہ سو اسی روپے۔ تمہارا دل خوش ہو جائے گا۔ ہم سمجھیں گے ہمارا خدا خوش ہوگیا“۔

کیا بولا؟ ایک تھاؤزنٹ کتی.......... باپ رے! ایک ہی رات میں ایک تھاؤزنٹ کتی؟ اپن کو دیس میں بولا تھا۔ ادھر سب چیٹ ہے.......... سچ بولا تھا۔ پانچ سو روپے لینا تو بات کرو۔

آہستہ آہستہ صمد جو نے ان لفظوں کو اپنے کانوں میں اترتے سنا۔ آہستہ آہستہ ہی ان لفظوں کی تلخی اس نے اپنے اندر بہت اندر اترتے محسوس کی، اس نے حیران حیران سی نگاہوں سے اس دھان پان سی لڑکی کے چہرے کی طرف دیکھا۔ پانچ سو روپیہ لینا تو بات کرو۔ ادھر سب چیٹ ہے۔ پہلے جاستی دام بولتا ہے۔ پھر ہیگلینگ کرتا ہے۔ پھر بہت کمتی میں بیچتا ہے۔ صمد جو نے کچھ کہنا چاہا۔ اس کے ہونٹ تھرتھرائے، مگر کوئی آواز نہ نکل سکی............میرا خدا! یہ ہونٹوں کی خاموش تھرتھراہٹ، اتنے برسوں کے بعد۔

اس نے ڈھیرے سے کاغذ کا وہ پرزہ اٹھایا جس پر اس نے ابھی تھوڑی دیر پہلے حساب لگایا تھا۔ بے خیالی میں اس نے کاغذ کے پرزے پرزے کیے اور اچانک اسے محسوس ہوا، جیسے یہ چیتے کا بچہ ایک ہی جست لگا کے اس کے سینے پر سوار ہو گیا اور اپنے تیز نوکیلے دانت اس کی شہہ رگ میں پیوست کر دیئے۔

کہانی ایک علّیا کی

نور شاہ

''بابُو ا، آپ ایک نظر بُلبل کو دیکھ تو لیجئے۔''

میں خاموش سے آگے چل دیا جیسے میں نے اس کی بات ہی نہ سُنی ہو۔ اُس کی آنکھوں میں ایک عجیب قسم کی بے بسی چھا گئی۔ عجیب سی لاتعلقی، عجیب سی یاسیت، لیکن اُس نے ہمت نہیں ہاری۔ وہ تیزی سے میرے قریب آ گیا۔

''بابُو جی وہ خوبصورت ہے آپ اُسے دیکھ تو لیں۔ میری بُلبل آپ کو ضرور پسند آئے گی۔''

اب کی بار اُس کی آنکھوں میں ایک التجا تھی۔ میں نے اُسے مایوس کرنا مناسب نہیں سمجھا۔ اس سے پہلے کہ میں کچھ کہتا وہ خود ہی بول اُٹھا۔

''اگر دن بھر بُلبل آپ کے ساتھ رہے گی تو کرایہ نسبتاً کم ہوگا۔''

''اچھا بھئی۔ چلو دکھاؤ کہاں ہے تمہاری بُلبل۔''

وہ خوش ہوا۔ اُس کے مُردہ چہرے پر چمک آ گئی۔ چپٹی ناک، خارش زدہ ہاتھ، پھٹے پرانے اور میلے کپڑے اُس کی ستم زدہ زندگی کی نمائندہ کر رہے تھے۔

''بابُو جی دیکھ لیجئے بُلبل کو کتنا سفید ہے رنگ اِس کا۔''

میں نے بُلبل کی طرف دیکھا۔ اس کی موٹی موٹی آنکھوں میں حرکت ہوئی۔ اس کے کان پھڑ پھڑائے۔

اُس نے کہا۔ ''بابُو جی! بلبل جیسی گھوڑی گلمرگ میں ایک ہی ہے۔ اتنی تیز رفتار گھوڑی گلمرگ میں کیا سارے کشمیر میں نہیں مل سکتی۔''

وہ بولتا رہا۔ سُنتا رہا اور گھبراتا رہا۔ ایک ادیب قلم کو چلانا جانتا ہے۔ بُلبل جیسی تیز رفتار گھوڑی پر بیٹھنا میرے لئے ایک مُشکل ترین لمحہ تھا۔ معاملہ کی نزاکت کو سمجھ کر میں نے گھوڑے والے سے کہا۔

''بھائی گھوڑے والے۔ تمہاری یہ تیز رفتار گھوڑی تم ہی کو مبارک ہو۔ میں پہلی بار گھوڑے کی سواری کر رہا ہوں۔ کہیں نیچے گرا دیا تو۔؟ نا بھئی نا، مجھے تمہاری بُلبل نہیں چاہئے۔''

اُس کے چہرے پر مردنی چھا گئی۔ مگر تیزی سے بولا۔

''بابو جی برا نہ مانئے گا، ایک بات بتا دوں؟''

''کیا۔؟'' میں نے چونک کر پوچھا۔

''سچ پوچھئے تو یہ گھوڑی بڑی سست رفتار ہے۔''

''پھر ابھی تم کیا کہہ رہے تھے؟''

''بابُو جی کیا کریں پیٹ کے لئے بہانے بنانے پڑتے ہیں۔'' میں حیران ہو گیا۔ اپنے بیوی بچوں کو روٹی کا روکھا سوکھا ٹکڑا کھلانے کے لئے اپنا پیٹ پالنے کے لئے اُنہیں کیا کیا جتن کرنے پڑتے ہیں۔

میں خاموشی سے بُلبل کی گردن کے ملائم بالوں پر ہاتھ پھیرنے لگا۔ اور اِس پر سوار ہونے کی کشمکش ہی میں تھا کہ میرے قریب ایک جیپ آ کر رُک گئی اور اس سے راج

اُترا۔ مجھے دیکھتے ہی بولا۔

''ارے تم کب پہنچے؟''

''بس ابھی آیا۔ تمہارا ہی منتظر تھا۔'' میں نے جواب دیا۔

''آؤ چلیں۔'' اُس نے کہا۔

راج نے بُلبل کی لگام کو پکڑ لیا اور کچھ کہے بغیر اس پر سوار ہو گیا۔ میں نے گھوڑے والے کی طرف دیکھا۔ اس کی یاسیت بھری نگاہوں میں مجھے مسرت کے فانوس چھوٹتے نظر آئے۔ بُلبل آہستہ آہستہ اپنے راستے پر چل پڑی۔ میں نے ایک کمزور سے گھوڑے کا انتخاب کیا اور اس پر سوار ہو کر راج کے ساتھ ساتھ چلنے لگا۔

''تمہارا کیا نام ہے؟'' تھوڑی دُور چل کر میں نے اس سے پوچھا۔

''علیا۔۔بابُو، علیا۔۔''!

وہ ہمارے پیچھے تیزی سے بھاگ رہا تھا۔ گرتا پھسلتا، جیسے وہ بھی ایک گھوڑا ہو۔ میں نے گھوڑے کو چابک مارا۔ وہ ذرا تیزی سے دوڑنے لگا۔ علیا کی رفتار میں بھی تیزی اور پھرتی آ گئی۔ وہ زور زور سے سانس لینے لگا۔ میں نے گھوڑے کو ایک جگہ پر کھڑا کیا۔ راج مجھ سے آگے نکل گیا۔

''رک جاؤ۔۔علیا۔۔'' میں نے کہا۔

وہ رُک گیا اور اپنا سانس سنبھالنے لگا۔

''علیا تم تیزی سے مت دوڑو۔ لو میں بھی آہستہ چلتا ہوں۔ صاحب کو جانے دو۔''

وہ مجھے گھُور گھُور کر دیکھنے لگا۔ شاید سمجھا ہوگا میں بھی کوئی بیوقوف سیاح ہوں جو اس کے دُکھ درد کو سمجھنے کی کوشش کر رہا ہوں۔

''بابو جی۔۔'' علیا بولا۔ ''آپ جیسے سبھی تو نہیں ہوتے گھوڑوں کے ساتھ اُن کی رفتار سے دوڑنا ہماری زندگی بن چکی ہے۔ اسی رفتار پر ہمارے پیٹ کا دارومدار ہے۔''

مجھے ایسے لگا جیسے یہ اُس کی زندگی کا نشیب و فراز ہو۔ جسے پار کر اُس کی کشتیِ حیات کنارے لگ سکتی ہے۔ شاید اس کی منزل ہو، جہاں پہنچ کر وہ اپنے شیریں خوابوں کی تعمیر سکتا۔

بُلبل اب آہستہ آہستہ جا رہی تھی۔

دفعتاً علیا کی آواز سُنائی دی۔۔ ''بابو جی۔''

''کیا ہے۔''

''بابو جی آپ کو قسمت دیکھنی آتی۔'' اُس نے دھیمے لہجے میں کہا۔

میں حیران ہو گیا۔ نہ جانے علیا کو قسمت کے اِس ہیر پھیر میں کس نے اُلجھا دیا تھا پہلی ہی نظر میں آدمی علیا کی قسمت کیا اس کے آنے والے بچوں پوتوں کا حال بتا سکتا ہے۔ مصیبت۔ مُصیبت۔ اُس کی ہر رگ میں، خون کے ہر قطرے میں مصیبت، طوفان، غم اور نا اُمیدی چسپاں ہے۔ اور یہی غم، یہی مصیبت اس کی زندگی ہے۔

''ہاں علیا! میں نے تمہارے ماتھے کی لکیروں کو پڑھ لیا ہے۔ تم دُوسرے جنم میں امیر بن جاؤ گے۔''

''بابو جی یہ جنم کیا ہوتا ہے؟'' اُس نے بڑی معصومیت سے پوچھا۔

''جنم۔۔مرنے کے بعد آدمی دوبارہ زندہ ہوتا ہے نا اُسے جنم کہتے ہیں۔''

''مگر بابو جی ہم جنم ونم نہیں مانتے ہیں۔''

میں نے آہستہ سے کہا۔ ''علیا تمہارے دوسرے جنم میں آنے کا یہ مطلب نہیں کہ تم مر کر پھر سے زندہ ہو جاؤ گے۔ گندگی کے اس لبادے کو پھینک کر سادہ اور صاف لبادہ پہننے میں کامیاب ہو جاؤں۔ تمہیں پیٹ بھر کر کھانا ملے۔ تمہاری بیوی بچوں کو بھوکا نہ رہنا پڑے۔ انسان ہو کر حیوان کی طرح نہ دوڑنا پڑے تو وہی تمہارا دوسرا جنم ہو گا۔۔سمجھے!''

''بابو جی۔۔'' اُس نے کہا۔ ''پچھلے سال ایک اور بابو جی نے ایسی ہی باتیں کی تھیں۔''

''کیا کہا تھا اُس نے؟'' میں نے دلچسپی لیتے ہوئے کہا۔

''اُس نے میرے بیٹے سے کہا تھا کہ چند ہی روز میں وہ چھ سات گھوڑوں کا مالک بن جائے گا۔ وہ بہت امیر بن جائے گا۔ میرا بیٹا اس قدر خوش ہوا تھا کہ اُس نے بابو جی سے کرایہ بھی نہ لیا۔''

''اچھا۔''

''ہاں بابو جی۔''

''پھر کیا ہوا۔ کیا وہ امیر بن گیا؟''

''بابو جی، اُس واقعے کے چند دن بعد جب میرا بیٹا ٹنگمرگ سے لنگمرگ سواری کی تلاش میں آ رہا تھا کہ گھوڑے سمیت کھڈ میں گر کر مر گیا۔''

میں چونک پڑا۔ علیا مُسکرا رہا تھا جیسے اس کا بیٹا نہیں مرا ہو بلکہ ایک کھلونا گر کر

ٹوٹ گیا ہو۔ لیکن مجھے علیا کی اس مُسکراہٹ میں ایک بھرپور طنز کی جھلک دکھائی دی اور مجھے لگا جیسے وہ اپنی بربادی پر مُسکرا رہا ہو۔

''بابو جی۔'' اُس نے اپنی بات جاری رکھتے ہوئے کہا۔ ''بابو جی ہماری زندگی کیا ہے۔ اِس سڑک پر یہ بکھرے ہوئے پتھر دیکھ رہے ہیں نا آپ۔۔۔ بے جان، بے حس اور خاموش پتھر۔ بس ہم بھی یہی پتھر ہیں۔ جو بھی یہاں سے گزرتا ہے ان پتھروں کو روندتا چلا جاتا ہے۔ ہماری زندگی کو روندتا چلا جاتا ہے۔ کوئی نہیں سمجھتا کہ ان پتھروں میں بھی جان ہے۔ ان کا بھی دل ہے، یہ بھی چیخنا چاہتے ہیں۔ بابو جی وہ زمانہ کب آئے گا جب یہ پتھر بھی چیخ سکیں گے۔ روندتے ہوئے پیروں کو اپنے سے دور رکھ سکیں گے۔ ہم جانتے ہیں وہ زمانہ کبھی نہیں آئے گا، کبھی نہیں، صدیوں دستور تھوڑے ہی بدل سکتا ہے۔''

اور میں علیا کے بارے میں سوچنے لگا۔ اُس کی خوشی، اُس کا دُکھ، جب کچھ بھی سمجھ میں نہیں آیا تو میرا دماغ جھنجھلا گیا۔ اس جھنجھلاہٹ سے بچنے کے لئے میں نے علیا سے پوچھا۔

''کیا بُلبل تمہاری ہے؟''

''نہیں تو بابو جی۔ میری گھوڑی میرے بیٹے کے ساتھ کھڈ میں گر کر مر گئی نا۔''

''او۔۔۔'' یہ سن کر مجھے بڑا دُکھ ہوا۔

''لیکن یہ گھوڑی کس کی ہے؟''

''گھوڑوں کے بیوپاری کی ہے۔ میری بیوی بیمار ہے، بہت بیمار۔ دوا کے لئے کوئی پیسہ نہیں۔ اُسے دوا چاہئے۔ خوراک چاہئے۔ میں غریب ہوں۔ بابو جی دوا کہاں سے لاؤں، غذا کہاں سے لاؤں۔ جوان بیٹا تھا۔ اپنا گھوڑا تھا۔ دونوں مر گئے۔ اور اب یہ گھوڑی

لی ہے۔ یہی بلبل بابو جی۔ مالک کو روز پیسے دینے ہیں۔ چاہے کچھ کماؤں یا نہ کماؤں۔ کوئی خریدار ملے یا نہ ملے۔" وہ خاموش ہو گیا۔ اور پھر خود ہی بولنے لگا۔

"اُجرت دینی ہے بابو جی، کرایہ دینا ہے۔ بابو جی میری بیوی بچ جائے گی نا؟"

"ہاں علیا تمہاری بیوی بچ جائے گی۔ ضرور بچ جائے گی۔"

وہ خاموش ہو گیا اور میں سوچنے لگا۔ آخر کب تک بجھے تاروں کی چھاؤں میں یہ لوگ ٹھنڈی کونپلوں کے خواب دیکھتے رہیں گے۔ آخر کب تک یہ لوگ جھوٹی مسکراہٹوں سے دُنیا کا ساتھ دیتے رہیں گے۔ کب تک ان کی آنکھوں میں اُداسی تیرتی رہے گی۔ کب تک؟ خُدا جانے کب ان کی زندگی بھی زندگی بن جائے گی۔ خوشحال اور شاداب زندگی۔ پھولوں، گیتوں اور نغموں سے بھرپور زندگی جہاں بھوک نہ ہو، فاقے نہ ہوں، ننگا نہ رہنا پڑے۔ جہاں پیٹ بھر کر کھانا ملے۔

اتنے میں ہم گلمرگ پہنچ گئے۔ راج میرا انتظار کر رہا تھا۔ ہم نے گھوڑے والوں سے کہا کہ وہ واپسی پر ہمارا انتظار کریں۔ گلمرگ کے موسم کا کبھی کوئی بھروسہ نہیں۔ ابھی تپتی ہوئی دُھوپ ہے اور ابھی موسلا دھار بارش۔ اس لئے جب گلمرگ میں ہمارے پہنچتے پہنچتے بارش شروع ہو گئی تو میں حیران نہیں ہوا۔ ہم جلدی سے ٹورسٹ ہوٹل میں داخل ہوئے۔ میں باہر برآمدے میں ہی بیٹھ گیا اور دُور خلاؤں میں گھورنے لگا۔ گلمرگ کی خوبصورتی میں کھو گیا۔ علیا کی کہانی نہ جانے میرے ذہن کے کس تاریک کونے میں گم ہوئی۔ میں وہ جگہ بھول گیا جہاں علیا رہتا ہے۔ اس کی بیمار بیوی رہتی ہے۔ جہاں دوائی نہیں ملتی۔ جہاں زندگی کی کوئی قیمت نہیں۔ جہاں صرف ویران اور سیاہ راتیں راج کرتی ہیں۔ جہاں کبھی سویرا نہیں آتا۔

جہاں۔۔؟

گلمرگ کتنی خوبصورت جگہ ہے۔

''او بھئی عرفان۔۔!'' مجھے راج کی آواز سنائی دی۔ میں مُسکرا دیا۔ اور اس کی طرف دوڑ گیا۔ وہ اندر ایک اور آدمی کے ساتھ مے نوشی میں مشغول تھا۔ وہ دونوں گھوڑے والوں کی موجودہ حالت میں اُلجھ گئے تھے۔ راج کہہ رہا تھا۔ ''یاران کی حالت اتنی نازک ہے اس سے زیادہ نازک تو اپنی حالت ہے۔ اُدھر بوڑھا باپ سانپ بن کر دولت پر چمٹ کر بیٹھا ہے۔ ادھر میں کنگال ہو رہا ہوں۔ ستر سال عمر ہے اور بیوی رکھی ہے بیس سال کی۔ حد ہوگئی شرافت کی۔ اب اس گھر میں میری کیا گزر ہوگی جہاں ماں کی عمر بیس سال ہو۔۔۔!''

''یہ تو ٹھیک ہے۔'' نوجوان بولا۔۔ ''گھوڑے والوں کی حالت پتلی ہے تو ہونے دو۔ اگر جوانی میں ہم نے ان چیزوں کے متعلق سوچنا شروع کر دیا تو تپ دق ہو جائے گی۔ اور میرا بھائی اس مرض کا ڈاکٹر ہے۔ مگر اس کے پاس اسی مرض کا واحد نسخہ ہے جو مجھ پر آزمایا نہیں جا سکتا۔''

''کون سا نسخہ بھئی۔'' راج نے ایک اور پیگ انڈیلتے ہوئے کہا۔

''موت کا۔''

ہم سب بے ساختہ ہنس پڑے۔

اور میں سوچنے لگا۔ یہ گھوڑے والوں کی اقتصادی حالت کے متعلق باتیں کر رہے ہیں یا اپنے والدین کے متعلق! میرے ذہن میں علیا اور بُلبل کی کہانی پھر اُبھرنے

لگی۔ یہ لوگ شراب پی رہے ہیں اور علیا کی بیوی دوائی کے لئے ترس رہی ہے۔ راج کی منہ سے شہابی رنگ کی مے چھلکتے دیکھ کر میرے سامنے علیا کی خون تھوکتی مدقوق بیوی کی تصویر ناچنے لگی۔

میں گھبرا سا گیا اور وہاں سے بھاگ کر باہر چلا آیا۔

''کہاں جا رہے ہو؟'' نوجوان نے پوچھا۔

''باہر جا رہا ہوں۔ بارش میں بھیگنے سے مزہ آتا ہے۔''

وہ دیدے پھاڑ پھاڑ کر مجھے دیکھنے لگا جیسے میں والٹ ڈیزنی کا کوئی کارٹون ہوں۔ میں بالکل اسی انداز میں مسکرا دیا۔ اور باہر چلا آیا۔ تھوڑی دیر بعد راج بھی چلا آیا۔ ہم گلمرگ کی گاف لنکس میں دوڑتے رہے پھسلتے رہے۔ راج کہہ رہا تھا۔ ''عرفان سوچ رہا ہوں پتا جی کے مرنے کے بعد میں کیا کروں۔''

میں نے حیرانی سے اُس کی طرف دیکھا۔ یہ لڑکا کس مزے سے اپنے باپ کی موت کا تذکرہ کر رہا ہے اور اُس گھوڑے والے نے کس انداز میں اپنے بیٹے کی موت کا تذکرہ کیا تھا۔ راج کے انداز میں ایک شان ہے۔ ایک ہونے والی کامیابی کی خوشی، گھوڑے والے کے انداز میں ایک شکایت تھی۔ مستقبل برباد ہونے کی ایک کراہ تھی۔ ایک تڑپ تھی، ایک طنز تھا!

''راج کبھی سوچ سمجھ کر بھی باتیں کیا کرو۔''

''اس میں سوچ کی کون سی بات ہے۔ وہ ہزاروں روپے اپنی جوان بیوی پر لٹا رہا ہے اور وہ ہے کہ۔۔۔۔!''

''راج۔۔۔'' میں جانتا تھا کہ وہ کیا کہنا چاہ رہا ہے۔

''میرے خوبصورت افسانہ نگار، سچائی سچائی ہے۔ تم بزدل ہو کہ اصلی بات کہنے سے ڈرتے ہو۔''

''کیوں۔۔۔!''

''اِس لئے کہ میرے سامنے میرے ہمدرد بنتے پھرتے ہو اور میرے بعد بڑی شان سے میری ماں کی باتیں کرتے ہو۔ ڈیر تم سب بُزدل ہو۔ یہاں آکر گھوڑے والوں سے اُن کی درد بھری داستان سُن کر اُن کی مصیبتوں پر چیختے رہو گے اور پھر چند لمحے بعد اُنہیں بھول جاؤ گے۔ کیونکہ وہ بھولنے والی چیز ہے۔''

وہ مُسکرایا اور اپنا کردار ٹٹونے لگا۔ راج نے جو کچھ کہا وہ حقیقت پر مبنی تھا۔ مجھے محسوس ہوا راج عظیم ہے۔ وہ پھر کہنے لگا۔ ''تم ادیب ہو ہمیشہ لوگوں کے درد اور خوشی اور دوسری چیزوں کا جائزہ لیتے ہو۔ کبھی اپنے اندر کے کردار کو بھی ٹٹولا ہے۔ ابھی گھر جا کر ان گھوڑے والوں پر ایک کہانی لکھو گے۔ اپنے اندر کے انسان کو دیکھو۔ اپنی کمزوریوں کو ٹٹولو۔ تم بذاتِ خود ایک کہانی ہو۔۔!''

''مگر آج تم یہ سب کیوں کہہ رہے ہو۔''

''اس لئے کہ ہوٹل سے تم اُس طرح بھاگ گئے تھے جیسے ہم اس دُنیا کی باتیں نہیں کر رہے تھے۔''

راج بولتا رہا اور میں سُنتا رہا۔۔!

راج عظیم ہے۔!!

رات کو جب راج کی جیپسی میں سری نگر آ رہے تھے تو وہ ہنس کر کہہ رہا تھا۔

''یہ سالے گھوڑے والے بڑے چالاک بنتے ہیں۔''

''کیوں کیا ہوا؟''میں نے پوچھا۔

''ارے ہوتا کیا۔ اپنے پاس پچاس روپے کا ایک جعلی نوٹ تھا۔ وہ گھوڑے والے کو دیا۔۔۔!''

میرا دماغ تیزی سے گردش کرنے لگا۔ میری نگاہوں کے سامنے علیا کی صورت پھر گئی اور مجھے ایسا لگا جیسے کہہ رہا ہو۔

''بابو جی، میری بیوی بیمار ہے، بہت بیمار ہے۔۔۔ دوائی کے لئے کوئی پیسہ نہیں ، اسے دوا چاہئے۔۔۔ خوراک چاہئے۔۔۔ میں غریب ہوں۔۔۔ بابو جی۔۔۔ بابو جی؟!

☆☆☆

گونگے گلاب

عمر مجید

گُل دو دن سے غائب تھا اسی لئے ساجد بے حد اُداس تھا۔ اُس کی اُداسی کی ایک اور وجہ یہ تھی کہ آج صبح سے ہی اُس کا باپ، اُس کی ماں کو پیٹتا چلا آ رہا تھا......!

ساجد اچھی طرح جانتا تھا کہ جس روز اُس کا باپ گھر دیر سے لوٹتا تو اُس کی ماں کو ضرور پیٹتا......اور یہ سب کچھ وہ تب سے دیکھتا چلا آ رہا تھا جب سے اُس نے ہوش سنبھالا تھا۔ اپنی آٹھ سالہ زندگی میں ساجد نے اپنے غصیلے باپ کو ایک مرتبہ بھی مُسکراتے ہوئے یا ہنستے ہوئے نہیں دیکھا تھا۔ اُس کے چہرے پر ہر وقت کرختگی چھائی رہتی، عام حالات میں بولتا بھی وہ بہت کم تھا۔ باپ کی آواز سنتے ہی اُس کا ننھا سا دل دھک سے رہ جاتا۔ اپنی ٹانگوں سے جان سی نکلتی ہوئی محسوس ہوتی۔ اور وہ فوراً اپنی تمام مصروفیات چھوڑ کر ماں کے پیچھے چُھپ جاتا۔ جب تک باپ گھر میں موجود رہتا وہ ایسا محسوس کرتا جیسے لال پگڑی والے گھر میں موجود ہوں۔ چپ چاپ دم سادھے کسی کونے میں دُبکا پڑا رہتا یا اپنی ماں کے پیچھے اس طرح چھپنے کی کوشش کرتا کہ اُس پر باپ کی نظر نہ پڑ سکے۔ ماں خاموشی سے باپ کے سامنے کھانا رکھ دیتی یا سماوار سے چائے انڈیلتی تو وہ نظریں نیچی کئے ہوئے فرش کو تکتا رہتا......اُس کا باپ اکثر کھانے کے موقعے پر ہی چیخنے لگتا۔ چیختے چیختے اُس کی آنکھیں انگاروں کی طرح دہکنے لگتیں۔ منہ کے کونوں سے جھاگ بہنے لگتی۔ بعض اوقات کھانے کی تھالی یا کوئی دوسرا برتن اپنی پوری قوت سے چولھے کی طرف کھینچ مارتا......اور پھر اس کی ماں کو پیٹنا شروع کر دیتا۔ اس کی ماں خاموشی سے لاتیں اور گالیاں سہتی رہتی۔ اُس نے آج تک اپنی ماں کو کبھی چیختے ہوئے نہیں دیکھا تھا۔ لیکن جب اُس کا باپ اُس کی ماں کو پیٹ کر

گھر سے باہر جاتا تو وہ ساجد کو سینے کے ساتھ لگا کر بہت روتی۔ ساجد کی نیلی آنکھوں میں بھی آنسو آجاتے اور پھر اپنی ماں کی گود میں سر چھپا کر سو جاتا......!

جس روز اُس کا باپ زیادہ غصے میں ہوتا اور ہمسایوں کی مداخلت کے باوجود چیختا رہتا تو اُس روز ساجد کی حالت پاگلوں کی حالت جیسی ہو جاتی وہ فوراً گھر سے باہر آجاتا، تارکول کی لمبی سیاہ سڑک پر دوڑنا شروع کر دیتا۔ اُس کی آنکھوں سے آنسو بہتے رہتے...... اُس کا دم پھولنے لگتا لیکن وہ دوڑتا ہی چلا جاتا۔ بستی پیچھے رہ جاتی، سڑک چھوڑ کر وہ بادام کے باغوں میں سے گذرتا ہوا پہاڑی کے دامن میں بھی دوڑتا رہتا اور پھر راستے کے اختتام پر نشیب میں جنگلی گلابوں کی جھاڑیوں کے پیچھے ناشپاتی کے پیڑ سے لگ کر ہانپنے لگتا۔ آہستہ آہستہ اُس کی سانسیں اعتدال پر آجاتیں لیکن آنسو اُسی رفتار سے بہتے رہتے...... پھر وہ ناشپاتی کے پیڑ سے ٹیک لگاتا۔ اسی حالت میں اس کی آنکھ لگ جاتی۔

آنکھ کھل جانے پر وہ اپنے آپ کو بے حد اُداس پاتا اور اُداس نظروں سے جنگلی گلابوں کو دیکھتا رہتا...... دیودار اور چیڑ کے جنگل سے آنے والے ہوا کے لطیف جھونکے اُس کے لمبے ریشمی بالوں کو الجھاتے۔ نالے کا پانی بہتا رہتا۔ گلاب مسکراتے رہتے۔ ہرے رنگ والے طوطے، کچی ناشپاتیوں کو کتر کتر کر ڈالتے، سنہرے پروں والی تتلیاں اُس کی آنکھوں کے سامنے سے گزر جاتیں۔ چیونٹیوں کی لمبی قطار بادام کے باغوں سے ہو کر گزرتی۔ گل ہزار مرتبہ چیخ کر اپنا چوڑا چکلہ سینہ ٹھونک کر اس کو اپنی طرف متوجہ کرنے کی کوشش کرتا۔ لیکن اس کی آنکھیں جھپکنے کا نام تک نہ لیتی تھیں۔ گل کو ایسا لگتا جیسے ساجد بولنے کے ساتھ ساتھ سننے کی طاقت بھی کھو بیٹھا ہو، تب گل ناشپاتی کے پیڑ سے اُتر کر کپڑے پہنتا اور جنگل کی طرف قدم بڑھاتا۔ لیکن ساجد خاموشی کے ساتھ گلابوں کو دیکھتا رہتا۔ جو ہمیشہ اُس کی طرح خاموش رہا کرتے تھے۔ جو مُسکراتے تھے لیکن بول نہیں سکتے

تھے۔ پھر جب سورج بادام کے باغوں کے پیچھے اپنا سُرخ جال پھیلاتے ہوئے دور مغربی پہاڑیوں کے پیچھے چھپنے چلا جاتا تو وہ سر جھکائے ہوئے بستی کی طرف اپنے قدم بڑھانا شروع کر دیتا۔

جنگلی گلاب، نالے کا نیلا پانی اُس میں چھپے ہوئے سفید گول گول پتھر اور نالے کے کنارے اُگے ہوئے جعفری، شور مچاتے ہوئے طوطے، چیونٹیوں کی لمبی لمبی قطاریں، ناشپاتی کا پیڑ، سنہری اودی اور طاوسی رنگ کی تتلیوں کے علاوہ گل بھی اُس کے دوستوں میں شامل تھا۔ گل جس کے بال بے حد لمبے تھے اور چمکیلے تھے۔ جس کا سینہ بے حد چوڑا تھا اور جو ہر وقت مُسکراتا رہتا تھا۔ لکڑی کے کارخانے میں ملازم تھا۔ شام کو جب کارخانے میں چھٹی ہوجاتی تو وہ نالے پر نہانے کے لئے آجاتا۔ شروع شروع میں وہ اس لمبے بالوں والے لڑکے سے لاتعلق سا رہا تھا۔ جو کبھی ناشپاتی کے پیڑ سے لگ کر بے حد اُداس نظروں سے جنگلی گلابوں کو دیکھتا رہتا یا کبھی چیونٹیوں کی لمبی قطاروں کے ساتھ رینگتا ہوا نظر آتا۔ لیکن ایک روز جب وہ نالے سے نہا کے نکل رہا تھا تو اُس نے دیکھا کہ وہ لڑکا ناشپاتی کے پیڑ سے لگ کر رو رہا ہے۔ وہ یوں محسوس کرنے لگا جیسے لڑکا چیخنا چاہتا ہو لیکن چیخ نہ سکتا ہو۔ کچھ دیر تک خاموشی سے اُس کو دیکھتا رہا پھر اُس کے کندھے پر اپنا ہاتھ رکھ دیا۔ لڑکا چونک سا پڑا۔ اس نے لڑکے سے رونے کی وجہ پوچھی لیکن لڑکا روتا رہا۔ تھوڑی دیر بعد اُس کو پتہ چلا کہ لڑکا گونگا ہے۔ وہ بول نہیں سکتا۔ اس کے دل میں لڑکے کے لئے ایک عجیب سی ہمدردی کا جذبہ جاگ اُٹھا۔ اُس نے لڑکے کو چپ کرانے کی ہر ممکن کوشش کی اس کو چمکارا۔ سنہری رنگ کی تتلیاں پکڑ کر لائیں۔ کچے بادام توڑ کر لایا۔ سر کے بل کھڑا ہو گیا۔ لیکن لڑکے کا رونا بند نہ ہوا تب گل نے اپنے دونوں ہاتھ منہ سے لگائے اور چیخنے لگا۔

''میں ٹارزن ہوں ...... میں گدھا ہوں ...... تم میرے باپ ہو ...... لیکن اے

میرے خوبصورت پھول میں تم کو ہنسا کر ہی دم لوں گا......!''

پھر وہ ناشپاتی کے پیڑ کی ایک اونچی ڈال پر لٹک گیا اور جھولنے لگا۔ ڈال اس کا وزن برداشت نہ کرسکی، چُرمُرا کر ٹوٹ گئی اور گل سمیت نالے میں گر گئی۔ عین اُس لمحے ساجد نے رونا بند کر دیا اور نالے کی طرف بڑھا۔ گل اس طرح کراہتے ہوئے پانی سے باہر آگیا جیسے اُس کو زبردست چوٹ آئی ہو۔ لڑکے کی پریشانی میں اضافہ ہوتا رہا۔ اس کے قریب پہنچ کر گل دوزانو جھک گیا۔ اس نیلی آنکھوں میں پریشانی کے سوا کچھ بھی نہ تھا۔ اپنا گورا گول مٹول ہاتھ گل کے کندھے پر رکھ کر اس کے قریب آگیا۔ گل نے اس کو اپنے سینے کے ساتھ لپیٹ لیا۔ لڑکے نے ایک ڈھیلی سانس چھوڑ دی۔ کچھ دیر بعد وہ آرام سے گُل کی گود میں سو رہا تھا۔ اور گل کی آنکھیں دور مغربی اُفق پر جمی ہوئی تھیں۔ دوسرے روز گل نے لڑکے کو راہ دیکھتے ہوئے پایا۔

پھر ایک روز لڑکا اپنی ماں کو بھی ساتھ لے آیا۔ وہ شاید اپنی ماں کو اپنے ایک دوست سے ملانا چاہتا تھا کیونکہ جب وہ جنگل میں کوئی نئی چیز یا کسی نئے دوست کو دریافت کرتا تو اپنی ماں کو ضرور دکھانے لے آتا۔ گل کو دیکھتے ہی اس کی ماں گھبرا سی گئی لیکن جلد ہی اس کو معلوم ہوگیا کہ ساجد کے اور دوستوں کی طرح گل بھی اس کا بے ضرر قسم کا دوست ہے۔

دکھ میں کوئی انسان معمولی سی ہمدردی کا اظہار کرے تو دکھی انسان اپنے دل کے سارے دروازے کھول کر دکھوں کے آنسو بہانے لگتا ہے۔

گُل خاموشی سے ساجد اور اس کی ماں کی کہانی سن رہا تھا۔ ساجد کی ماں سے ہی اس کو معلوم ہوگیا کہ ساجد پیدائشی گونگا نہیں بلکہ تین برس کی عمر میں جب کہ ایک ننھے منے بھائی کا بڑا بھائی بن گیا تھا۔ تو باپ کا غصہ قہر بن کر ٹوٹ پڑا تھا۔ ایک روز اس کی لات چلی۔

ساجد کا تین روز کا بھائی اس سے جدا ہو گیا۔ ساجد جو صرف تین سال کا تھا ایک دم خاموش ہو گیا............ایسا خاموش کہ اب تک......!

ساجد کی ماں پھوٹ کر رو رہی تھی۔

آج بھی جب اس کے باپ نے اس کی ماں کو پیٹنا شروع کیا تو وہ سہم کر ایک کونے میں دبک گیا۔ غفار کا کا بھی آ گیا۔ زونی موسی بھی آ گئی اور بہت سارے لوگ آ گئے لیکن اس کا باپ چیختا ہی رہا۔ وہ دبے پاؤں باہر آ گیا اور باہر آتے ہی تارکول کی سیاہ لمبی سڑک پر دوڑنے لگا۔ اب وہ ناشپاتی کے پیڑ کے تنے سے لگ کر خاموشی سے جنگلی گلابوں کو دیکھ رہا تھا۔ وہ اب تک کئی بار اس چھوٹے سے راستے کی طرف اپنی نظریں اُٹھا چکا تھا جو جنگل کی طرف جاتا تھا۔ لیکن گُل کا دور تک نشان نہ تھا۔

ایک لمبی سانس لے کر وہ اُٹھ کھڑا ہوا اور نالے کی طرف بڑھا۔ رات کو بارش ہوئی تھی۔ نالے کا نیلا پانی گدلا ہو گیا تھا۔ چلو سے پانی پکڑ کر وہ نالے میں واپس ڈالنے لگا۔ نالے کے کنارے بیٹھ کر وہ اکثر اسی طرح وقت گذارا کرتا تھا۔ اب کی بار جو اس نے اپنے ہاتھ پانی میں ڈال دیا تو وہ کسی نرم لچکیلی چیز سے ٹکرائے۔ اس نالے میں چھوٹی مچھلیوں کے بہتات تھی۔ اس خیال سے کہ کوئی بڑی مچھلی رہی ہو۔ ساجد نے اُس نرم لچکیلی چیز کو مضبوطی کے ساتھ پکڑ لیا اور پھر اپنے دونوں ہاتھ پانی سے باہر لے آیا۔

نیلی آنکھوں میں بجلی سی چمک گئی۔ دل دھک سے رہ گیا۔ ہونٹ لرزنے لگے......!

اُس کے ہاتھوں میں ایک نوزائیدہ بچے کی لاش تھی......! لاش نیلی پڑ گئی تھی اور پھول گئی تھی۔ سر کے بال چپک کر رہ گئے تھے......! جب اس کا باپ اُس کی ماں کو پیٹتا تو

اُس وقت اُس کے دل میں ایک طوفان سا اُٹھتا۔ اُس سے بہت تیز طوفان اس وقت اُس کے دل میں اُٹھا۔ چیخنے کی ناتمام کوشش سے اُس کا بدن لرزنے لگا۔

وہ شاید بچے کی لاش سے پوچھنا چاہتا تھا...... بھیّا تو کون ہے......؟ تو اس نالے میں کیوں پڑا ہوا تھا............؟ تمہاری ماں کون ہے......؟ تم کس کے بھیّا ہو......؟ کیا تمہارے ابّو نے بھی تمہاری ماں کو پیٹا تھا؟ کیا تم بھی اپنے ابّو کی لات سے مر گئے ہو............؟ وہ ہزاروں سوال نوزائیدہ بچے کی لاش سے پوچھنا چاہتا تھا۔ لیکن بچے کی لاش خاموش تھی۔ اور خود اس کی آنکھوں میں آنسوؤں کے سوا کچھ بھی نہ تھا......!

جب وہ چیخ بھی نہ سکا اور اپنے سوالوں کا جواب بھی نہ پا سکا تو اس نے لاش وہیں کنارے پر ڈال دی، اور پھر گلاب کی جھاڑیوں اور لمبی لمبی گھاس کو پھلانگتا ہوا بادام کے باغوں کی طرف دوڑ پڑا۔

گھر میں ایک منحوس خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ باپ گھر میں نہ تھا۔ ماں چولہے سے اُٹھتے ہوئے سرخ شعلوں پر نظریں جمائے کچھ سوچ رہی تھی۔ اس نے ماں کو آواز دینا چاہی لیکن ہمیشہ کی طرح ناکام رہا۔ پھر دوڑ کر اپنے بازو ماں کے گلے میں ڈال دیئے۔ ماں نے اُس کے بالوں پر ہاتھ پھیرا۔ اُس سے کئی سوالات کئے لیکن ساجد اشاروں اور کنایوں کے باوجود اُس کو اپنا مطلب نہ سمجھا سکا۔ زیادہ سے زیادہ وہ یہی سمجھ سکی کہ ساجد کو اپنا تین روز کا بھائی یاد آ گیا ہے۔ کیونکہ اکثر وہ ایسی ہی حرکتیں کرتا تھا۔

جب وہ بھی اپنا مطلب سمجھانے میں ناکام ہوا تو اس نے ماں کا دامن پکڑ لیا اور باہر کی طرف لے جانے لگا۔ ماں سمجھ گئی کہ وہ اُس کو جنگل کی طرف لے جانا چاہتا ہے۔ لیکن آج اُس نے جانے سے انکار کر دیا کیونکہ آج دن میں جتنی بھی گالیاں اور جتنی بھی لاتیں

اس کو سہنا پڑی تھیں، اُن سب کی ذمہ داری ساجد کے دوست ٹارزن پر عائد ہوتی تھی......!

وہ ساجد کو زبردستی واپس اندر لے آئی۔ اور اُس کو کمرے میں دھکیل دیا اور دروازہ باہر سے بند کر دیا۔ ساجد بہت دیر تک دروازے پر زور آزمائی کرتا رہا۔ ماں اپنے دل کے دروازے کے ساتھ ساتھ اپنے کانوں کی کھڑکیاں بھی بند کر چکی تھی۔ کمرے کی کھڑکی کافی اونچی تھی۔ اُس تک پہنچنے کی کوشش میں ساجد اس قدر تھک گیا کہ بے سدھ ہو کر ایک طرف گر گیا۔

دوسری صبح جب سورج مشرقی پہاڑیوں کے پیچھے ہی چھپا ہوا تھا۔ ساجد بادام کے باغوں میں بھاگتا چلا جا رہا تھا......! گلاب کی جھاڑیوں کے قریب پہنچ کر وہ رک گیا۔ اگر وہ چیخ سکتا تو اس کی چیخ آسمان تک پہنچ جاتی۔

نوزائیدہ بچے کی لاش پر ایک بڑا سا سیاہ رنگ کا کتا جھکا ہوا تھا۔ ساجد کے چہرے پر غصے اور بے بسی کی ملی جلی لکیریں اُبھر آئیں۔ اس نے قریب پڑے ہوئے ایک نوکیلے پتھر کو اُٹھایا اور اپنی پوری قوت سے کتے پر کھینچ مارا۔

پتھر کُتے کے سر پر لگ گیا۔ اور ایک خطرناک غرّاہٹ کے ساتھ دور ہٹ گیا۔ کتے کے ہٹتے ہی ساجد نے ناشپاتی کے پیڑ کی طرف چھلانگ لگا دی وہ اپنے آپ کو سنبھال نہ سکا۔ منہ کے بل گرا۔ سر اٹھا کر دیکھا تو نوزائیدہ بچے کی لاش اس کی آنکھوں کے سامنے تھے۔ اس کا ایک بازو اور چہرے کا آدھا حصہ غائب تھا۔

ساجد نے ایک مرتبہ پھر چیخنا چاہا لیکن اب کی بار بھی وہ ناکام رہا۔ کتے کی آنکھوں میں ساجد کے لئے نفرت کے سوا کچھ بھی نہ تھا۔ ایک اور پتھر اُٹھا کر اس نے پوری قوت سے کتے کی طرف کھینچ مارا۔ کتے نے اُچھل کر اپنے آپ کو بچا لیا۔ اس کے بعد ساجد جیسے پاگل ہی ہو گیا۔ اپنے دونوں ہاتھوں میں پتھر اٹھا کر وہ نالے میں کود پڑا۔ کتا جنگل کی

طرف بھاگا۔ ساجد دوڑتے دوڑتے ہانپنے لگا۔ ایک جگہ ٹھوکر کھا کر گر پڑا۔ اس کو گرتا دیکھ کر کتا رُک گیا اور پھر فوراً ناشپاتی کے پیڑ کی سیدھ باندھی۔ ساجد کپڑے جھاڑنا بھول گیا اور اپنی پوری رفتار سے کتے کے پیچھے لپکا۔ لیکن نئے منظر نے اُس کو اور بھی دیوانہ کر دیا۔ تین کوے نوازئیدہ بچے کی لاش پر ٹھونگیں مار رہے تھے۔ اور دوسری طرف ایک مریل کتا لاش کی ٹانگ کو چبا رہا تھا۔ ساجد نے ایک مرتبہ پھر چیخنا چاہا لیکن اب کی بار بھی پتھروں سے کام چلانا پڑا۔ کوے اُڑ گئے لیکن اوپر ناشپاتی کے پیڑ پر ہی منڈلاتے رہے۔ مریل کتا ٹانگ چھوڑ کر الگ ہٹ گیا۔ اور خود ساجد بے سدھ ہو کر اس طرح نوازئیدہ بچے کی لاش پر گر گیا کہ ساری لاش اس سے ڈھک گئی......! پھپھوندی ہوئی لاش اُس کے سینے سے لگی ہوئی تھی۔ وہ خود بے تحاشا ہانپ رہا تھا۔ گلا خشک اور زبان کانٹا بن کر چبھ رہی تھی۔

کوے کائیں کائیں کرتے ہوئے اُس کے اُوپر سے گزرنے لگے۔ دونوں کتے قریب آنے کی کوشش میں لگ گئے تھے۔ موٹا تازہ کتا زیادہ دلیر ثابت ہوا ساجد کی پرواہ کئے بغیر اُس نے اپنی تھوتھنی ساجد کی ٹانگوں میں گھسیڑ دی جہاں سے لاش کا ایک حصہ جھانک رہا تھا۔ سرسراہٹ محسوس ہوتے ہی ساجد ہڑبڑا کر اُٹھ بیٹھا۔ کتے کو اپنے قریب دیکھ کر اس کے چہرے پر خوف کی لہر دوڑ گئی، ایک بڑا سا پتھر اُٹھا کر اس نے سیدھا کتے کے ماتھے پر کھینچ مارا۔ کتے کے ماتھے سے خون کا فوارہ پھوٹ پڑا۔ خوف زدہ ہونے کے بجائے وہ خونخوار انداز میں غرّایا۔ اور ساجد کو ایسا محسوس ہوا جیسے اُس کے ریڑھ کی ہڈی پر برف کی سل رکھ دی گئی ہو۔ ابھی وہ اس خطرے سے نمٹنے بھی نہ پایا تھا کہ دوسری طرف سے مریل کتا آگے بڑھا اور لاش کو اپنی طرف گھسیٹنے لگا۔ اور اس سے پہلے کہ ساجد مریل کتے کی طرف متوجہ ہو جاتا۔ سیاہ رنگ کا کتا مریل کتے پر جھپٹا اور اس کو بھنبھوڑنے لگا۔ کتوں کو آپس میں لڑتا دیکھ کر تینوں کوے جو اُوپر منڈلا رہے تھے، خونخوار بازوں کی طرح شکار پر

جھپٹ پڑے۔ ساجد پتھر لے کر اُن پر ٹوٹ پڑا۔ کوّے فوراً اُڑ گئے۔ اتنی ہی دیر میں سیاہ کتا اپنے دشمن کو بھگا چکا تھا۔ ساجد کو کوؤں پر پتھر برساتے دیکھ کر وہ اپنے کام میں لگ گیا۔ ساجد نے پاگلوں کی طرح اُس کی طرف چھلانگ لگا دی۔ کتا پھرتی کے ساتھ ہٹ گیا۔ لیکن لاش اُس کے منہ میں دبی رہی۔ اور اسی حالت میں اُس نے جنگل کا رُخ کیا۔ نہ جانے کب تک ساجد اُس کے پیچھے دوڑتا رہا۔ نہ جانے وہ کب تک روتا رہا، اُس کا سارا جسم گرد و غبار سے لت پت ہو گیا۔ وہ اب بھی کتّے کے پیچھے پتھر لے کر بھاگ رہا تھا۔ لیکن اب اُس کو ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے سینکڑوں کتے اس کی ٹانگوں کو کھینچ رہے ہوں۔ اور ہزاروں کوّے اُس کی پیٹھ پر ٹھونگے مار رہے ہوں۔

آنکھوں کے سامنے چھا رہے اندھیرے میں اُس نے گُل کو اپنی طرف بڑھتے ہوئے دیکھا۔ گل کی بانہوں میں آتے ہی وہ چیخ پڑا۔

''ساجد!'' گل کے لہجے میں حیرت ہی حیرت تھی۔

ساجد کی آواز بے حد دھیمی تھی وہ کہہ رہا تھا۔

''بھیا......بھیا...... کتا لے گیا۔ کُتا...... لے گیا۔۔''

گل پھٹی پھٹی نگاہوں سے اُس کی طرف دیکھ رہا تھا۔ اتنے میں اُس پر کسی کا سایہ پڑا۔ اُس نے سر اُٹھا کر دیکھا......وہ ساجد کی ماں تھی............تھوڑی دیر بعد گل، ساجد کو گود میں اُٹھائے ہوئے جنگل کی طرف جا رہا تھا..............ساجد کی ماں پیچھے پیچھے آ رہی تھی۔

☆☆☆

لالہ رُخ

ویریندر پٹواری

جب ہم مشرق میں رہنے والے سو رہے تھے تب مغرب میں واقع کسی ٹیلی ویژن چینل نے ایک صدمہ خیز خبر دنیا کے ناظرین کو دکھادی تھی! میں نے صبح سویرے خبر دیکھ لی!

بوسٹن امریکہ سے دہلی کے لیے اڑان لے چکا مسافروں سے بھرا ایک طیارہ زمینی رابطے سے کٹ جانے کی وجہ سے کھو چکا ہے یا پھر تباہ ہو چکا ہے!

ایک آفت انگیز حادثہ کے بارے میں خدشات کا بوجھ اتنا بھاری ہو چکا ہے کہ ہر ذی ہوش انسان کی سانسیں دَبی جارہی ہیں! حالانکہ کھوجی طیارہ اور ہیلی کاپٹر اپنی کوششوں اور ناکامیابیوں کے بارے میں مسلسل اطلاعات دے رہے تھے! مگر جب وہ یہ اطلاع بھی دیتے رہے تھے کہ تقریباً پانچ ہزار فٹ کی بلندی پر پرواز کرتے ہوئے جہاز خاموشی میں ڈوب گیا ہے تب مجھے وہ منظر آنکھوں کے سامنے بار بار آتا رہا جو میں نے چند روز پہلے ایک گہری کھائی میں، ایک بم کے دھماکے سے اڑادی گئی، بس کا منظر اپنے چینل کے لیے شوٹ (Shoot) کیا تھا!

دل تڑپ اٹھا تو بیس سال بعد لالہ رُخ کی یاد آئی! وہ اس لیے کہ وہ دکھ کو بھی، اپنی گفتار سے، مواد سے، محبت کے احساسات سے اور انسانی رشتوں کی مدد سے یوں محسوس کرنے میں مدد کیا کرتی تھی گویا نو کیلے پتے بھی پھولوں کا لمس نہ سہی، خوشبو بکھیر کر سکھ کے تصور کو اُبھارنے کا مشورہ ضرور دیا کرتے تھے! اس لیے ایک پیاسے کو تشنگی کا احساس تو ہونا ہی تھا نا؟؟

اچانک اپنے اردگرد موجود لوگوں کی باتیں سن کر میں اپنے آپ سے گھبرانے لگا تھا! ٹی وی چینلوں پر حادثے کے شکار لوگوں کے نام آنہیں رہے تھے مگر اچانک کچھ لوگوں نے منظم طریقے سے وادی میں یہ خبر پھیلادی کہ جہاز میں مایۂ ناز صوفیانہ موسیقی پر عبور پا چکی وادی کی گلوکارہ عارفہ بھی سفر کر رہی تھی! عارفہ کا نام سن کر یاد آیا کہ وہی تو ہم سب کی پیاری لالہ رُخ ہے؟ مگر اگلے ہی لمحے حالات کو کروٹ لیتے دیکھ کر لرز اٹھا تھا کیونکہ جو ہوا تھا وہ قیامت خیز تھا!

سوچا تھا کیا اور کیا ہوتے دیکھتا رہا!!

لالہ رُخ کی سلامتی کے لیے دعا کرنے کو جی چاہتا تھا مگر اپنی خواہش کو یوں اکھڑتے ہوئے دیکھا تھا گویا بادل پھٹ کر اپنے اُبل رہے پانی سے میرے پاؤں سے زمین کرید کرید کر نکال رہے تھے! سمجھ نہیں پا رہا تھا کہ افسوس ناک اظہار میں احتجاج کی تپش کیوں تھی؟ ایسا تاثر دیا گیا تھا کہ امریکہ میں بیس برس گزارنے کے بعد لالہ رُخ اپنی ہم شکل جڑواں بیٹیوں کے ساتھ اپنے مادر وطن آنا چاہتی تھی مگر ایک سازش کے تحت اُس کو اغوا کر دیا لیا ہے یا قتل کیا گیا ہے۔

اور ایک بین الاقوامی سازش کے تحت 'عارفہ' نام کی ایک آواز کو 'لالہ رُخ' کا لقب دے کر ان کے خیالات کو غلط رنگ میں پیش کرنے کی گستاخی کی گئی ہے! سیاسی سماجی اور تاریخی حقیقت کو مسخ کرنے کی خاطر!

جواز یوں پیش کیا گیا تھا کہ عارفہ کی ہم شکل جڑواں بیٹیاں ہیں جن میں ایک نے ہندو سے شادی کی ہے اور دوسری ایک مسلمان کی زوجہ ہے!

ایک بیٹی کا نواسہ ہے اور دوسری بیٹی کی نواسی ہے! اور کسی ہمدرد سے یہ اطلاع مل چکی

تھی کہ ہندو نواسہ، ایک گہری سازش کے تحت اپنی نانی کو ایک ہندو جوگن ظاہر کرتے ہوئے ایک زاہدہ سے اس کا تشخص چھین لینے کا منصوبہ بنا چکا ہے! یعنی اپنے رنگ میں رنگ کر، اس کا جسم آگ کے سپرد کرنا چاہتا ہے، جو ایک عظیم گناہ ہے بلکہ ایک سنگین ترین جرم بھی ہے!

خبر میں برق کی لپک تھی یا سچائی کی تجلی، لالہ رُخ وادی کے عوام کے لیے وہ ست رنگی چادر ہے جو یک رنگی بن کر اپنی خوشبو کے تاثر سے اپنی پہچان کروادیتی ہے!

بقول لالہ رُخ:

رنگ باتیں کریں اور باتوں سے خوشبو آئے
من چمن بن جائے تو سمجھ سے خوشبو آئے!

گویا اُس کی گونج رہی آواز کے ساتھ ایک بہت پہلے گزر چکا منظر، کالے بادلوں کو چیر کر، ایک دریچے سے اندر آرہی روشنی کا لبادہ پہن کر سامنے آگیا ہو۔!

ہماری لالہ رُخ ایک سفید رنگ کا پیرہن پہن کر دریا میں ڈبکی لگا کر جوں ہی جھیل سے کھلے ہوئے کمل کے پھول کی طرح نظر آگئی تھی تب وہ خود کو گھور کر دیکھ رہی نگاہوں کے جال میں پاکر، اپنی ہی نظریں جھکا کر بڑبڑاتی رہی تھی۔

پارسائی کا دعویٰ کرنے والوں کو دیکھو!
وہ جو ہوا کرتے تھے خوشبو، روح کے شیدائی!
بن گئے ہیں بد بو دار جسموں کے سودائی!

وہ منظر اچانک دھند میں نظر آنے والا شناسا چہرہ اپنی ہی خواہشات کا عکس ثابت ہوا! اور اب میں خود پر گزر چکے واقعات کو جوڑ کر وثوق سے کہہ سکتا ہوں کہ جب عارفہ کے

بارے میں عام لوگ فکر مند تھے تب چند تاجروں نے حالات کا سودا طے کر لیا تھا! گویا مجھے ایک اسٹریچر پر چڑھا کر پھر ایک Ventilator پر رکھ کر کب لوکل جہاز سے اُتار کر بین الاقوامی جہاز میں بٹھا کر ایک اجنبی ہوائی اڈے پر اُتار دیا کہ مجھے معلوم نہیں!

حیران ہوں کہ میرے ساتھ میرے کیمرے کے بغیر کوئی بھی ایسی دستاویز نہیں جو میرے ہوائی سفر کو آسان بنا دیتی۔ پھر بھی میں سفر کر رہا ہوں!

جو بھی ہوا وہ حیرت انگیز ہونے کے ساتھ یوں لگ رہا تھا گویا ہوا میں اڑتے دیکھ کر یوں محسوس کرتا رہا گویا طلسمی دنیا کی سیر کر رہا ہوں! فرق یہ کہ میں ایک جن کے کندھوں پر سوار ہو کر بادلوں کے اوپر اُڑ نہیں رہا تھا بلکہ ایک طیارے میں سفر کر رہا ہوں!

خیر میں اپنے ہم سفروں کی باتیں سن کر یہ جان گیا تھا کہ میں سرکاری کھوجی ٹیم کے چھ عدد ہیلی کاپٹروں میں ایک رضا کار کھوجی ٹیم کا واحد کیمرہ مین ہوں جو ایک مقصد کے لیے ہوائی حادثے میں شکار ہو چکے بد بخت انسانوں کی مدد کرنے کی خاطر اپنے سر پر کفن باندھ کر کارِ نیک کرنے کے عزم، بلندی کو چھو لینے کی خواہش کو اپنے دل میں، رگوں میں خون کی طرح، حفاظت کے ساتھ رکھ لینے کے عادی ہو چکے ہیں! ظاہر ہے کہ میں ہوش میں آتے ہی اپنے ہم سفروں سے متاثر ہوا! ان کی خواہش جان کر!

میرے ہم سفر، چونکہ وادی کی زبان بول نہیں سکتے تھے اس لیے عارفہ کے ایک مقبول نغمے کا ترجمہ گنگنا رہے تھے۔ من روح کی آواز ہے۔ بلکہ من ہی روح ہے۔ روح کی قدر کرو۔ مگر اس کو کھلاتے کھاتے۔ اتنا مت کھلا دو کہ تمھارے اندر۔ چھپ کر بیٹھا۔ شیطان باہر آ کر۔ ایک درندہ بن کر۔ دبوچ لے تم میں بیٹھے انسان کو!

ترجمہ سن کر وہ نغمہ یاد آیا جو ہماری لالہ رُخ عوام کے پرزور اصرار پر وہاں گایا کرتی

تھی جہاں ہندو، مسلمان کے ہر جسم میں انسان موجود ہوتے تھے:

دل سے دلوں کو ملادے!

انسان کو انسانوں سے ملادے!

کیونکہ سب کا محرم تو!!

تو ہی تو دُنیا بنانے والے!!

غیروں کو بھی اپنوں سے ملادے!

لالہ رُخ کے اس مقبولِ عام نغمے کو توڑ موڑ کر گا رہے تھے! محبت کے گیت کو وہ ایک جنگی ترانے کی طرز پر گا کر، نغمے کا مفہوم یوں بدل رہے تھے گویا صدیوں پہلے حملہ آور، اپنی لشکر کے قدموں کی آہٹ سے ہم آہنگ ہو کر بینڈ باجے بجا کر، امن پسند لوگوں کو ڈرا کر، یاد با کر، اپنی فتوحات کا ڈنکا بجا کر اُن کو اطلاع دے رہا ہو کہ سامنے سے ہٹ کر ہمارے پیچھے پیچھے چل کر شامل ہو جاؤ! یا مرنے کے لیے تیار ہو جاؤ!!

لالہ رُخ کے نغموں کو ایک نئی لے اور رنگ میں سن کر جانے کیوں ان کے فلسفوں میں آلودگی کا احساس ہونے لگا! گویا ایک ہوائی گرداب کی وجہ سے اپنے آپ کو سمجھا نہیں پایا کہ میں کہاں سے آ رہا ہوں اور کہاں جا رہا ہوں! بلکہ کیا کرنے جا رہا ہوں؟

پہلی بار لالہ رُخ کے فلسفوں کو ترک کر کے اپنے، عقیدوں سے اپنے بچاؤ کے لیے کچھ کرنے کو جی چاہا تو اپنے دادا سے رٹے ہوئے تمام وید منتروں کو یہ سمجھ کر اور سوچ کر کہ جونہی بچاؤ کی خاطر پوجا مکمل کر دوں تب نظریں اٹھا کر آسمان کو گھورتا رہوں! ایک کرشمہ دیکھنے کی خاطر، مگر جیسا چاہا تھا ویسا ہوا نہیں تھا! یعنی اعتقاد لرزتا ہوا نظر آیا تھا! جیسے میں دھارمک فلموں میں دیکھا کرتا تھا! منتروں کے جاپ کے فوراً بعد نہ آسمان میں کوئی اُجلا

بادلوں کا ٹکڑا نظر آیا اور نہ کہیں بھی کسی آسمان کے گوشے میں بادل کے ٹکڑوں پر، باوقار ملبوسات پہن کر کوئی دیوی دیوتا نظر آیا! ظاہر ہو چکا تھا کہ مجھے بچانے کی خاطر کوئی بھی مسیحا نظر نہیں آیا تھا-!!

ایک بار پھر اپنی لالہ رُخ کے نغموں کی گونج مجھے اپنی طرف متوجہ کرنے لگی تو دل نے گواہی دی کہ کہیں وہ آس پاس ہی موجود ہے اور اپنے مخصوص انداز میں گنگنا رہی ہے!-!!

خدا کے بندوں کو دیکھ کر
خدا سے منکر ہو رہی ہے دنیا
بُرے ہوں جس خدا کے بندے
کبھی وہ اچھا خدا نہیں ہے
گدھ کو لمبی عمر عطا کی اُس نے
اونچی پرواز کے لیے پرے بھی دیے
اس کو تیز نگاہی کا عطیہ بھی دیا جس کو
مگر نادان کی نظریں
زمین پر پڑی لاشوں پر
جمی رہتی ہیں
اکثر زمین پر اُتر کر
لالچ بن
بدبودار بے جان، جسموں کو
کھاتا رہتا ہے انجام سے بے خبر ہو کر

بوجھ اٹھا کر اُڑ نہیں پاتا ہے مضبوط پر ہو کر زمین پر پڑا رہتا ہے احمق

چینٹیوں کی خوراک بن کر۔!

عقلمندوں کو سمجھانے کی خاطر

نادانوں کو دکھانے کی خاطر!!

دراصل لالہ رُخ کی باتیں یا نغمے سوچ اور سمجھ کے دائروں سے نکل کر خوشبو کی طرح چار سو پھیل کر سانسوں میں سما کر ایک تاثر قائم کر دیتے ہیں! اور خوشنودگی میں تاثیر مسیحائی ہے اور مسیحائی دراصل پاکیزگی ہے! پاکیزگی میں قدرت کی خوشنودگی ہے! اور خوشنودگی ہی زندگی ہے! ہاں دھان کے پودوں کے ساتھ ایک ہم شکل گھاس بھی اُگتی رہتی ہے، اس شیطانی گھاس کو ایک سمجھدار کاشتکار شیطانی گھاس سمجھ کر اکھاڑ دے گا تو دھان کی فصل کیسے ہوگی! گویا شفقت محنت کا میٹھا پھل ہے! غفلت تباہ کن ہو سکتی ہے؟ کہیں مجھ سے کوئی غفلت تو نہیں ہو رہی ہے؟؟

رِشی منیوں کی وادی میں شیطان اگر مناسب گھاس کو اُگنے نہ دیں تو وہی رحمت کہلائے گی! یعنی ہم جو صدیوں سے کرتے آئے ہیں وہی کرتے رہیں تو بہتر! تب ہی تو جنت کا تصور قائم رہے گا! دائم رہے گا! ہاں مگر ہم سے پوچھو کہ جنت کا وجود کیا ہے؟ تو سن لو ایک گونگا شہد کھا کر کیسے بتا سکے گا کہ مٹھاس کیا ہوتی ہے؟ راز کو راز ہی رہنے دو تو بہتر! راز کو راز ہی رہنے دو تو بہتر۔

میں ایک ہیلی کاپٹر میں بیٹھے اپنے اجنبی ہم سفروں کے ارادوں کو بھانپ چکا ہوں! اگر میں ان کی باتیں غور سے نہ سن لیتا تو میرا ان کے ساتھ ہونا ایک معمابن کر رہ گیا ہوتا! وہ ایک وادی کے ہی انسان سے، اس کی ہی زمین پر اُس کی مادری زبان میں اپنی بات دنیا کو بتا سکیں!! لالہ رُخ کی خاطر وہ اربوں ڈالر داؤ پر لگا چکے ہیں مگر اُس کی سلامتی کے لیے

دعائیں کرنے کی بجائے وہ اس کو دفن کر دینے کے منصوبے کیوں بنا رہے ہیں؟ کیوں؟ کیوں؟؟؟

لیکن میں جو بھی بیان کردوں گا یا عیاں کردوں گا اُس میں نہ تو جھوٹ کی ملاوٹ ہوگی اور نہ بناوٹ کی سجاوٹ ہوگی! یعنی ہماری لالہ رُخ جو ہماری روح کی نمائندگی کرتی آئی ہے وہ اب بھی کرے گی! یعنی میری کہانی میں واقعات کی سچائی ہوگی- جو تاریخ کے حوالوں کی زبان ہوگی! بنائے گئے حالات کی سیاست نہیں ہوگی! اور نہ تاجروں کے دُکانوں پر دستیاب سامان کی کہانی ہوگی!

کوئی مجھ سے پوچھ لے کہ ہماری لالہ رُخ کون ہے؟ میں بتادوں گا!

کون ہیں یہ لوگ جو ہماری وادی کے تہذیب، تمدن سوچ اور سمجھ کو اپنے رنگوں میں رنگ کر وادی میں دوقومی نظریات کو اچھال کر، نت نئے منصوبے بناتے ہی جا رہے ہیں! کبھی قبائلیوں کی وادی میں پہنچ کر، کبھی فوجیوں اور کبھی گھس پیٹھیوں کے بل بوتے جا رہے ہیں اور ہر بار اپنی اپنی تجارت کو منظر عام پر لا کر- ہماری لالہ رُخ کو دفن کرنے کے منصوبے بنا کر- عوام کو غلام بنا کر- یہاں کے منتخب حکمرانوں کو ہٹا کر- ہماری دفاعی فوج کو جنگی قیدی بنا کر- اپنے خوابوں کی تعمیر بھی دیکھ کر- جشن کی تیاریاں کر رہے ہیں؟ - جو بھی ہیں، نادان ہیں! وہ نہیں جانتے ہیں کہ وادی کے لوگ لالہ رُخ کو بچپن سے جانتے ہیں!

مجھے آج بھی وہ صبح یاد ہے! شاید اس لیے کہ وہ صبح انوکھی تھی!

جب ہندوستان کا بٹوارہ ہوا تھا تب میں سات سال کا تھا! میرے بڑے بھائی نے دیوار پر آویزاں نقشہ اُتار کر میرے دادا مرحوم سے پوچھا کہ اب بھارت ماتا کس کو کہیں- ایک کٹ چکے نقشے کے کس حصے کو؟ اور وہ جواب دیئے بغیر دریا کے کنارے یوں نظر آئے تھے گویا پوجا کر رہے ہوں! دراصل وہ رو رہے تھے! جانے کیوں؟ ہمارا گھر دریا کے دائیں کنارے پر تھا جواب ایک مکان ہے! اُف! اُف!

ہمارے گھر کے ساتھ ایک پتھروں سے بنا ہوا ایک پچاس فٹ لمبا اور دس فٹ چوڑا ایک چھوٹا سا میدان تھا جہاں محلے کے بچے کھیلا کرتے تھے! ساتھ میں ایک شیو جی کا مندر تھا جہاں صبح اور شام کو گویا میلہ لگا رہتا تھا جبکہ دن کو مندر کا پجاری بھی نظر نہیں آیا کرتا تھا!

چونکہ دریا میں پانی کی سطح نشیبی ہوا کرتی تھی اس لیے نہانے والوں کے لیے پتھروں سے بنائی گئیں کئی سیڑھیاں تھیں! چونکہ ان دنوں گھروں میں غسل خانے نہیں ہوا کرتے تھے اس لیے نہانے والے، اپنی باری کے انتظار میں سیڑھیوں پر بیٹھے ہوئے یوں نظر آیا کرتے تھے گویا روم کے دانشور اپنے غلاموں کے عبرت ناک کھیلوں کا تماشہ دیکھ کر سیاسی کھیل کھیلا کرتے تھے! چہروں پر مصنوعی تاثرات لا کر، کبھی سنجیدگی کا مظاہرہ کر کے اور کبھی معنی خیز مسکراہٹیں بکھیر کر، اپنے ہی لوگوں کی زندگی اور موت کے فیصلے کیا کرتے تھے مگر ہمارے محلے والے بلکہ اڑوس پڑوس کے محلوں سے آئے ہوئے ہندو اور مسلمانوں چند اختلافات کے باوجود بات بات پر قہقہے لگاتے ہوئے نرم، نہایت نرم لہجے میں باتیں کیا کرتے تھے! یعنی اپنی وراثت میں ملی امن پسندی کا مظاہرہ کرتے رہتے تھے! وادی میں جنم لینے والے رشیوں اور منیوں کی طرح! اپنے خیالات اور جذبات کے اظہار کے لیے دکھاوٹ اور بناوٹ کی ضرورت محسوس کیے بغیر! یعنی جو دل میں ہو وہی دماغ میں ہے!!

ہمارے محلے میں ایک ہی مسلمانوں کا گھر تھا اور حسن نانوائی کا مکان ہمارے مکان سے جڑا ہوا تھا! اور اتفاقاً حسن چاچا روز اپنے تنور سے نکالی گئی پہلی روٹی مجھے کھلایا کرتا تھا حالانکہ اُن دنوں ہندو اور مسلمان دونوں ایک دوسرے سے جذباتی اور خیالاتی ہم آہنگی کے باوجود ایک دوسرے کے گھروں میں کھایا پیا نہیں کرتے تھے بلکہ ایسے موضوعات کو جن پر بحث کرنے سے برف سے بھی حرارت ہونے کے خدشات، اندیشے یا دوریاں پیدا ہو سکتی تھیں ان کو مصلحتاً نظر انداز کیا جاتا تھا! یعنی لوگ ایک دوسرے کی عزت بھی کرتے تھے اور بے پناہ محبت بھی!

حسن چاچا مجھ سے جنون کی حد تک پیار کرتے تھے! میں ان کی چھ بیٹیوں کا بھائی تھا! ان دنوں بھی مذہبی موضوعات پر دریا کے کنارے پر مسلمانوں کے محلوں اور ہندوؤں کے محلوں میں پھوٹ ڈالنے کی کوشش کرنے والے، سیاسی گرج کے ساتھ نظر آیا کرتے تھے مگر بنائے گئے حالات سے واقعات دونوں فرقوں کی وراثت میں حاصل کی ہوئی دانشمندی کی روایت سے عام لوگوں کی زندگی پر اثرانداز نہیں ہوا کرتے تھے! وجہ یہ تھی کہ لوگ مذہب پرست تھے فرقہ پرست نہیں!

اس روز بھی جب دونوں کناروں کو ایک دوسرے سے جوڑنے والا قدیم پل، اس پار رہنے والے ہندوؤں اور اُس پار رہنے والے مسلمانوں کے مندر اور مسجد کی ملکیت کا تنازع بن گیا تھا! امن پسند لوگوں نے ایک کھر وچ کو ناسور بن جانے سے پہلے مرہم لگا کر زخم کے داغ کو بھی مٹا دیا تھا۔

یہی ہماری وادی کی روایت ہوا کرتی تھی بلکہ اب بھی ہے! میں معمول کی طرح تب کپڑے اُتار کر پانی میں ڈبکی لگا چکا تھا جب میں نے دریا کی سست رفتار میں ایک ٹوکری میں ایک نوزائیدہ بچی کو دیکھ کر شور مچایا تھا اور گھاٹ پر موجود سبھی لوگوں کو چونکا دیا تھا!

تب ایک سبز اور کیسری رنگ کے کپڑے میں ملبوس بچی کو میرے دادا مرحوم نے دیکھ کر کہا تھا کہ یہ کمل کا پھول جھیل سے اکھاڑ کر کس نے بہہ رہے پانی میں ڈال دیا؟ کمل کے پھول پر دنیا بنانے والے برہما بیٹھ کر دنیا کی خبر رکھ لیتے ہیں! جبکہ حسن چاچا نے ایک گیند کی طرح اُچھل کر کپڑے اُتارے بغیر دریا میں کود کر ٹوکری کو پانی سے نکال کر، غور سے دیکھ کر، بچی کے لالہ پھول کے مانند رخسار دیکھا کر چونک کر کہا تھا- ارے یہ لالہ رُخ کہاں سے آ گئی ہے؟

اگلے ہی لمحے گھاٹ پر ہو رہی لوگوں کی باتوں کو ایک عجیب قسم کی کیفیت نے دبوچ ڈالا تھا! پھر جب لوگوں کے لرز رہے ہونٹوں پر سرگوشیوں کو جنم دیا تھا ہم خیال لوگ ایک دوسرے کو یا تو سناتے رہے یا سمجھاتے رہے! گویا دانشوروں کی بحث ہو رہی تھی!

بچہ ہوتا تو سمجھتے کہ کل یگ میں واسودیو کی گرفت سے بھگوان کرشن نکل کر بہہ گیا ہے! کسی نے بچی کو کسی عیاش جوڑے کی ناجائز اولاد سمجھ کر پولیس کو اطلاع دینے کا مشورہ دیا تھا! ایک جنونی نے بچی کو ملٹری کے سپرد کرنے کا نعرہ بھی لگایا تھا! کسی نے اپنی معلومات کا مظاہرہ کرتے ہوئے یہ کہا تھا کہ حضرت موسیٰ کو بھی اپنی ماں نے خود پانی کے سپرد کر دیا تھا مگر وہ بیٹا تھا ایک بیٹی نہیں تھی! یعنی نوعیت بدل جاتی ہے! کسی نے فرقہ واریت کی شکار ہو چکی اور پھر خودکشی کر چکی ماں کو اپنی اولاد کو بچانے کی کوشش کو ایک فرقے کا مقصد بتا کر دُور بیٹھے دوسرے فرقے کی فطرت کا نام دیا تھا! اس سے پہلے کہ حالات کروٹ بدل کر ایک تکرار کو جھگڑے میں بدل دیتے یا راکھ کے نیچے دبائے گئے شعلوں کو ہوائیں دیتے! گھاٹ پر اپنی اپنی باری کا، صبر و تحمل سے نہانے کے لیے انتظار کرنے والے ایک ایک کر کے چل پڑے تھے۔ امن پسندی کا مظاہرہ کرتے ہوئے!

دیکھتے ہی دیکھتے گھاٹ خالی ہو گیا تھا! میں کپڑے پہنے بغیر دریا میں کھڑا تھا جبکہ حسن چاچا ٹوکری گود میں لے کر یہ بھول گئے تھے کہ ان کے بھیگ چکے کپڑوں سے سیڑھیوں پر گرتا ہوا پانی دریا میں جا رہا تھا! وہ خوش تھا کہ اس نے بچی کو پانی میں بہہ جانے سے بچا لیا تھا!

تب میں حسن چاچا کو تجسس سے دیکھ رہا تھا جب وہ بچی کو دیکھ کر تذبذب کے شکار نظر آ رہے تھے! وہ میرے دادا کو آوازیں دے کر، ایک جانے مانے انسانی رشتوں کے

قدر دان اور ویدوں، پرانوں بلکہ مذہبی معلومات میں ماہر، ایک سو سے زیادہ قدیم کتابوں کے انمول ذخیرے کے تحویل دار سے، ایک آدم زاد جس کو اُس نے فخر سے لالہ رُخ کا نام دیا تھا، کے بارے میں مشورہ لینا چاہتا تھا- مگر تب جب وہ اپنے بھیگے ہوئے کپڑوں سے ٹپک رہے پانی سے گھاٹ کے پتھروں کو تر کر رہا تھا! میرے مرحوم دادا نہائے بغیر مندر میں جا کر شیولنگ پر پانی چڑھانے گئے تھے!

بات شاید ختم ہو گئی ہوتی اگر دوسرے کنارے پر چند لوگ، ایک بچی کو مرکز بنا کر، ایک مسئلے کو ایک سیاسی دائرے کی محیط میں قید کرنے کے اشارے نہ دیتے!

اچانک اُس پار مسجد میں اور اس پار مندر میں سوچ کا ڈھنگ بدل گیا تھا! چونکہ بٹوارہ مذہب کی بنیاد پر ہو چکا تھا کوئی اپنی مذہبی شناخت سے انکار کیسے کر سکتا تھا؟ کیونکہ اپنی قطار میں شامل ہونا اہم بھی تھا اور لازم بھی تھا! لڑکی ہندو ہے یا مسلمان؟ مجرم ہے یا مظلوم؟ میرے دماغ میں ایسی باتیں آ نہیں سکتی تھی مگر حسن چاچا شاید ایک زبردست ذہنی تناؤ کے شکار تھے!

میری ماں کھڑکی سے جھانک کر، بار بار مجھے یہ اشاروں میں سمجھا رہی تھی کہ بچی کو حسن چاچا کی گود سے چھین کر اپنے گھر لے آؤں! مگر بچے عقل کے کچے ہوتے ہیں نا؟ مگر وہ خود یہ نیک کام کرنے کی خاطر گھاٹ پر نہیں آئی تھی! میں چاہتے ہوئے بھی کچھ بول نہیں پایا تھا-

اچانک حسن چاچا گھاٹ پر چھا چکے سناٹے کو توڑ کر، ٹوکری سینے سے لگا کر بول پڑا تھا- انسان کا بچہ ہے! کوئی اس کو پناہ دے یا نہ دے، میرے گھر میں سورج کے چھ رنگ آ چکے ہیں! لالہ رُخ ساتواں رنگ ہے! اُجالا میرے گھر میں آفتاب اپنے ساتوں رنگ لے کر در اور دریچوں سے داخل ہوگا!

میں گواہ ہوں اُس لمحے کا جب حسن چاچا نے میری موجودگی میں، فاطمہ چاچی کے ڈھکے ہوئے پستانوں کو عیاں کر کے لالہ رُخ کو اپنی نوزائیدہ بیٹی عابدہ کے دودھ کی شریک بناڈالا تھا!

میری ماں مجھ سے ناراض تھی کیونکہ اُس کو یقین تھا کہ لالہ رُخ کے چہرے پر عیاں نور یہ ثابت کر رہا تھا کہ بچی میرا (Meera) کا پُنر جنم ہے! وجہ یہ کہ اُس روز گل اشٹمی یعنی بھگوان کرشن کا جنم دن تھا جو اتفاقاً میرا بھی جنم دن تھا- بقول میری ماں، بچی عمر میں چھوٹی ہے ورنہ رادھا بھی ہوسکتی ہے اس لئے بچی میری ہے! دوسرے محلوں سے آئے چند رشتے داروں نے حسن چاچا کو نہ صرف روکا تھا بلکہ سختی سے ٹوکا بھی تھا- بچی اگر ہندو ہو تو ؟؟

مگر حسن چاچا نے نہایت عاجزی سے بھی اور بوکھلا کر یہی کہا تھا کہ اگر یہ بچی انسان کی دریا میں پھینکی ہوئی ایک چوہے کی اولاد ہوتی تب بھی میں دریا میں بہنے نہ دیتا! ایک چیل کو اپنے پنجوں میں اٹھا کر لینے نہ دیتا! حالانکہ چوہے بڑی بڑی پھاٹکوں کو کُتر کُتر کر اپنے چور راستے بنا دیتے ہیں! دیواروں کو کھوکھلا کر دیتے ہیں! پھر بھی ہم صوفی سنتوں کی اولاد اپنی فطرت کے غلام ہونے کی وجہ سے پکڑ چکے چوہے کو مارنے کی بجائے دریا میں پھینک کر، فیصلہ دنیا بنانے والے پر چھوڑ تو دیتے ہیں! مگر چوہے کو چیل کے پنجوں میں دیکھ نہیں پاتے! پھر یہ بچی تو نسلِ آدم ہے!

فاطمہ چاچی نے لالہ رُخ کو اپنا کر عارفہ کا نام دیا تھا مگر ہم لوگ اُس کو چاہت کے جذبوں کی قدر کرتے ہوئے لالہ رُخ یعنی سرخ رنگ کے پھولوں کے مانند رخساروں کے نام سے آوازیں دے کر روک لیا کرتے تھے- دُکھ میں سکھ میں- غم میں خوشی میں، برف پوش زمین پر دھنس دھنس کر چلتے چلتے یا سبز مخملی گھاس پر پکھراج کے مانند چمک رہے تھے- اور سکون محسوس کیا کرتے تھے!

میری ماں لالہ رُخ سے اتنا ہی پیار کرتی تھی جتنا فاطمہ چاچی عارفہ کو دُلار کیا کرتی تھی! کیونکہ سرخ گالوں والی عارفہ ایک بے حد خوبصورت بچی تھی جو معمولی کپڑوں میں بھی اپنی چھ بہنوں بلکہ محلے کی تمام ہم عمر لڑکیوں میں اپنے چال ڈھال اور خاص طور پر آنکھوں میں چمک کی وجہ سے الگ سی نظر آیا کرتی تھی! اس لیے میری ماں اکثر بالوں میں تیل لگانے کے بہانے یا اس کے لیے خود خریدے کپڑے پہنانے کے بہانے گھنٹوں اپنے ساتھ رکھ کر کچھ مزاحیہ انداز میں مگر زیادہ اوقات پر سنجیدہ گی سے لالہ رُخ کو یقین دلایا کرتی تھی کہ وہ ہندو ہے! کبھی بھری بزم میں لالہ رُخ کو کرشن کی رادھا ثابت کرنے کی خاطر نوٹنکیوں کا سہارا لے کر کہا کرتی تھی کہ ست یگ میں رادھا کرشن بھگوان سے عمر میں بڑی تھی اس یگ میں وہ عمر میں چھوٹی ہے! اس چکر میں لالہ رُخ اکثر میری ماں کے پلّو سے بندھی ہوئی نظر آیا کرتی تھی! ایک ساتھ ایک مسلمان ماں اور ہندو ماں کی شگفتگی کے قصے محلے میں بطور تفریح بھی سنائے جاتے تھے اور کبھی بطور تنقید بھی بحث میں آجایا کرتے تھے! مثلاً وہ لالہ رُخ سے ہی پوچھا کرتے تھے کہ آج اُس کا مسلمانوں والا روزہ ہے یا ہندو والا فاقہ (برت) ہے؟

لالہ رُخ تقریباً آٹھ سال کی تھی جب میری ماں نے اس کے ماتھے پر چندن کا تلک لگا کر خود منتروں کا جاپ کرتے ہوئے شیولنگ پر دودھ چڑھایا تھا تب اُس نے پہلی بار میری ماں کو محلے کی دوسری عورتوں کی موجودگی میں ٹوک کر آس پاس کے ماحول کو پل بھر کے لیے مفلوج کر دیا تھا کیونکہ وہ پوچھ بیٹھی تھی کہ وہ ایک پتھر کو کیوں دودھ پلا رہی ہے؟ جب اس کا پیٹ نظر نہیں آتا؟ بلکہ اس کا منہ بھی نہیں ہے؟ اس سے اچھا ہے کہ یہ دودھ کسی بچے کو پلا دو؟

محلے میں اس واقعہ کا چرچا ہوا تھا! اس نے مجھ سے بھی پوچھا تھا کہ پتھر کیا بھوکے ہوتے ہیں؟ میں نے سمجھانے کی کوشش کی تھی تو مجھے بھی پہلی بار چونکا دیا تھا– یہ کہہ کر کہ

بھگوان دن بھر اس کمرے میں کیوں رہتا ہے جہاں پجاری تالا لگا کر چلا جاتا ہے؟ بھگوان کیا کھو جاتا ہے؟ یا کوئی اس کو چُرا سکتا ہے؟

رفتہ رفتہ محلے والے جان گئے تھے لالہ رُخ کی باتوں میں معصومیت تو ہوتی ہے مگر عام روش سے ہٹ کر ایسا مواد بھی ہوتا تھا جس کے بارے میں سمجھ دار خاموشی اختیار کر لیتے تھے اور ناسمجھ باتوں کو گنگنایا کرتے تھے غالباً تصوف کے احساسات کو جگا کر رِشی منیوں، پیروں فقیروں کے ذہنوں پر دستک دینے کی خاطر!

مجھے یاد ہے وہ دن جب اس کی بڑی بہن کی شادی کی تقریبات میں ایک بارہ سال کی لڑکی نے اپنے ہونے والے بہنوئی کے استقبال میں ایک روایتی لوک رقص میں گانے کے الفاظ بدل کر ایک درویش کو اس قدر چونکا دیا تھا کہ وہ وجد میں آکر غیر روایتی انداز میں رقص کرتا رہا!

وہ منظر یاد آتے ہی گویا سامنے آجایا کرتا ہے! آج بھی وہ منظر گویا میری آنکھوں کے سامنے اُبھر رہا ہے؟ آس پاس پھیلے بادل کے ٹکڑوں کو چیرتا ہوا!!!

ایک طرف کھڑی لڑکیاں، ہاتھوں ہاتھ لے کر جھوم کر گا رہی تھیں جس کا جواب سامنے کھڑی لڑکیوں نے جھوم جھوم کر دینا تھا! ایک طرف کھڑی لڑکیوں نے دولھے کے نام کے قصیدے پڑھ کر کہا:

''دولھے راجا! جلدی سے آجا! ہم کر رہے ہیں تیرا انتظار!''

تو جواباً لالہ رُخ کی آواز یوں گونج پڑی تھی گویا آسمان بول پڑا تھا:

''ویسے ہی جیسے دھان کے پودے کرتے ہیں بارش کا انتظار!''

اس کے بعد ہماری لالہ رُخ کے نغمے ہندو اور مسلمانوں کی شادیوں میں عام زندگی سے جڑے غم اور خوشی کے موضوعات کو احساسات، تصوف اور وحدت ساتھ ساتھ چاہت، الفت، محبت کی خوشبو سے آشنا ہو کر، تذبذب، تجسُس، تناؤ جیسے سکون شکن حالات اور واقعات کا محبت اور مشقت کی قوتوں سے مقابلہ کرنے کا سلیقہ سکھاتے رہے!

مجھے اپنے بچپن اور لڑکپن میں لالہ رُخ کے بالکل قریب رہنے کا شرف حاصل ہوا تھا! وہ جب بھی مجھے دیکھا کرتی تھی تب میرا ہاتھ پکڑ کر گھاٹ پر لے جایا کرتی تھی! پھر ہم دونوں سیڑھیوں پر بیٹھ کر دریا کے اس پار مندر اور اُس پار مسجد کو دیکھتے رہتے تھے! وہ عام باتیں بھی ایسے کرتی رہتی جیسے وہ شعر سُنا کر شاعری کا مفہوم بھی گنگنا کر سناتی رہتی تھی!

پھر یہ سلسلہ جاری نہ رہ سکا تھا، لیکن مجھے اپنی جوانی کے وہ دن یاد ہیں جب میں اُس کے جسم کی سہانی آنچ محسوس کرنے کی خاطر اس کے ساتھ چپک کر بیٹھا کرتا تھا، لیکن اُس کی باتیں سُن کر میں جسمانی طور پر ایک تپش محسوس کیا کرتا تھا جبکہ ذہنی طور پر یوں لگا کرتا تھا گویا کسی برف پوش پربت پر کسی خدادوست کی ٹھنڈک محسوس کر رہا ہوں! وہ جو باتیں کیا کرتی تھی وہی اُس کی پہچان تھی دنیا بنانے والے! تم نے زمین بنا دی - اچھا کیا -!

مگر دو براعظموں کے درمیان -- بحر کیوں بنا دیئے؟

ایک ہی براعظم کے آر پار ممالک کے درمیان - خلیج کیوں بنا دیئے؟

ایک ہی ملک میں - خلیج سے جڑی جھیل بنا کر - پانی کا تناؤ کیوں پیدا کر دیا؟

انسان اور انسان کے درمیان - فتنہ کیوں پیدا کر دیا؟

تم نے ہوا میں کوئی لکیر نہیں ڈال دی ہیں - اچھا کیا ہے!

ورنہ دنیا میں ہر جاندار سانسوں کے لیے لڑ رہا ہوتا -!

ہمارے لڑکپن میں میری ماں ادھ کھلی کھڑکی سے جھانک کر اکثر بڑے اشتیاق سے ہمیں دیکھتی رہتی تھی اور پھر میرے گھر میں داخل ہوتے ہی سوالات کرتی رہتی تھی اور میرے جوابات سن کر اُن پر ایک جنونی کیفیت طاری ہو جایا کرتی تھی!

ایک روز میرے منع کرنے کے باوجود وہ لالہ رُخ کو رادھا بنا کر مندر میں لے گئی تھی اور چندن کے پلنے پر بھگوان کرشن کی تصویر رکھ کر، پلنے کی ڈور لالہ رُخ کے ہاتھ میں تھما کر لوری نما بھجن گا کر، بقول اس کے، کرشن بھگوان کو سلانے کے لیے اصرار کر رہی تھی -! اور اپنی خوشبوں کو دوبالا کرنے کی منتظر تھی، لیکن لالہ رخ نے اپنے مخصوص انداز میں، یعنی گنگنا کر کہا تھا کہ ایک چشمے کا پانی - جانے کس پہاڑ کی چوٹی سے - پگھل کر - دریا بن گیا! اور کب زمین میں جذب ہو کر - ایک چشمہ بن کر - ایک مسیحا کی طرح نمودار ہوا -! تاثیر مسیحائی دکھانے کی خاطر - صدیوں سے دونوں کناروں کو - ایک دوسرے سے جوڑ کر - اِس پار اور اُس پار - پیاسوں کی پیاس بجھاتا رہا - اس پار پرستش کرنے والوں کی اور اُس پار عبادت کرنے والوں کی - تشنگی محسوس کرتے ہوئے -! وقت چلتا رہا اور زندگی بدل کر جنم لیتی رہی اور مرتی رہی!

آج پانی کو کاٹ دینے کی سازش ہو رہی ہے - یہ جان گئی ہوں! اور دو نقطوں کو ملا دینے والی وہ لکیر! - جس کی رگ سے رگ جڑی ہوئی ہے! گرداب کا شکار ہو چکی ہے! یہ میں دیکھ چکی ہوں! - میں دریا پار کیسے کر پاؤں گی؟ یہ سمجھ نہیں پا رہی ہوں! - اور تم میرے واحد مددگار! - اور تم؟ میری کشتی کے ناخدا کو - سلانے کی کوشش کر رہی ہو؟ -؟ کیسی ماں ہو تم -؟؟

یہ کہہ کر وہ دیوانگی کے عالم میں یوں دوڑتی اور ہانپتی ہوئی نظر آئی تھی گویا کوئی اس

کا تعاقب کر رہا تھا! یا وہ کسی کو بھگا دینے کی کی خاطر اس کے پیچھے پڑ گئی تھی!!

یہ ان دنوں کی بات ہے جب حسن چا چا نے بھی مجھ سے آنکھیں چرا کر دوریاں بناڈالی تھیں- حالانکہ وہ اکثر گنگنایا کرتا تھا- روٹیاں پکاتے پکاتے-!

کوئی ہندو کوئی مسلمان- دونوں باہم ایک ہیں!

جس طرح اعداد جمنا- اور زم زم ایک ہیں!

میں لالہ رُخ کی یادوں میں کھو چکا تھا جب کھوجی ہیلی کاپٹروں نے یہ اطلاع دی کہ وہ جزیرہ نظر آچکا ہے جہاں جہاز کا ملبہ نظر آرہا ہے مگر وہاں فوری طور پر پہنچ پانا دشوار نظر آرہا ہے! وجہ موسم کی خرابی بتا گئی!

میرے ہم سفر خوش تھے! وہ اس لیے کہ کسی کے زندہ ہونے کا تصور بھی نہیں کیا جاسکتا تھا! چونکہ حادثہ کے چوتھے دن ملبے کے نیچے لاشیں ہی مل سکتی تھیں اس لیے یہ سوچ کر وہ فوری طور پر مقامی اور عالمی دباؤ ڈال کر عارفہ کی میت کو وادی میں دفن کرنے کا منصوبہ بنا چکے تھے! عارفہ کی آواز بلند کرنے کی خاطر! جبکہ میں دعائیں کرتا رہا کہ کوئی ایسا کرشمہ ہو جائے جس کی بدولت وادی کے کونے کونے میں ہماری لالہ رُخ کی آواز سن کر اُبل رہے سیاسی حالات میں عوام یہ اُبال دینے والے ایندھن کو اُکھاڑ کر پھینک دیں! ایسا تب ہوسکتا ہے جب سچ اُن کے سامنے آپائے! ورنہ نہیں!

امید جب پھول رہے سانسوں کو تھام لیتی ہے تو یادیں پھر تعاقب کرنے لگتی ہیں! واقعات کے گزرنے کے دوران موسم بدلتے رہتے ہیں! سال گزر جاتے ہیں- صدیاں گزر جاتی ہیں مگر بیتے دنوں کی یادیں ہوا کے جھونکوں کی طرح چھو کر، کبھی گرمی اور کبھی ٹھنڈک کا احساس دلاتی رہتی ہیں-! میں بھی ایسی کیفیت کا شکار ہو گیا ہوں وہ اس لیے کہ حساس ہوں!

پچاس برس گزر چکے ہیں- بچپن گزر چکا ہے- جوانی بیت چکی ہے اور اب بوڑھاپا تڑپا رہا ہے! ماضی کی یادیں عذاب کی شدت کا احساس دلاتی رہتی ہیں! کاش میری ماں نے اس روز لالہ رُخ کو رادھا کا لبادہ پہنا کر یہ ثابت کرنے کی کوشش نہ کی ہوتی کہ لالہ رُخ پیدائش سے ہندو ہے! کاش ہندو اور مسلمان، دونوں ہم آہنگ اور ہم نوا ہو کر دنیا کو بتا دیتے کہ لالہ رُخ وادی کی بیٹی ہے!

وہ دن قیامت خیز ثابت ہوا تھا- میری ماں کی خواہش کا احترام کرتے ہوئے رادھا کے ملبوسات پہن کر لالہ رُخ نے ہندوؤں کی ایک تقریب میں وہی نغمے سنائے جن کو سننے والے اشتیاق سے سن کر جھوم اٹھا کرتے تھے لیکن جانے کیوں ایک خیالاتی زلزلے کی زد میں آکر، اپنے آپ کو شادی بیاہ کے بندھنوں سے کوسوں دُور رکھنے والی زاہدہ یا جوگن حالات کے بھنور میں پھنس گئی تھی!

تب جب ایک عوام میں بے حد مقبول انسان کا ہندو ہونا یا مسلمان ہونا سیاسی رنگ پکڑ چکا تھا لالہ رُخ کو اپنے ایک مدّاح اور انسانی رشتوں کی قدر کرنے والے وادی کے ایک نیک اور امریکی شہریت والے ڈاکٹر کے ساتھ نکاح کے بعد امریکہ میں رہنا پڑا تھا مگر تب بھی اُس کا پاس رہنا یا دُور ہو جانا بے معنی ثابت ہوا تھا۔

یہ وہ سچ ہے جو کھوجی ہیلی کاپٹر میں بیٹھے میرے ہم سفر نہیں جانتے ہیں! وہ اس لیے کہ وہ نغموں کے قدردان نہیں بلکہ ان کے سوداگر ہیں!!

میں الیکٹرانک میڈیا کا ایک ایماندار رکن ہونے کا دعویٰ یہ سمجھ کر کر رہا ہوں کیونکہ کیمرہ ہر رنگ کو اپنے رنگ میں قبول کرتا ہے، ہاں دُھند میں رنگ پھیکا ہو سکتا ہے! آواز بدل بھی جائے تو مفہوم نہیں بدل جاتا ہے!! وحدت اور تصوف کے قدردان تبدیلیوں کو تب قبول

کرتے ہیں جب ٹھکرائی ہوئی سوچ میں خامیاں ہوں اور اپنائی ہوئی سوچ میں خوبیاں ہوں!

یادوں کے تعاقب کی وجہ سے لالہ رُخ کے بارے میں مختلف زاویوں سے نظر آنے والی خوبیوں اور خامیوں میں مصنوعی رنگوں کی آلودگی دیکھ کر میری فکر تجسّس اور تذبذب سے جاگ پڑتی ہے! وہ اس لیے کہ میڈیا کے ساتھ وابستہ ہونے کی وجہ سے میں لالہ رُخ کی جڑواں بیٹیوں کے بارے میں وثوق سے یہ کہہ سکتا ہوں کہ دونوں بیٹیاں اپنی ماں کی گلوکاری میں سنگت کرتی رہتی ہیں اور وہ کئی برسوں سے بھارت، پاکستان اور بنگلہ دیش کے عارضی طور پر رہنے والے یا امریکہ کینیڈا میں مستقل طور پر شہریت لینے والے اکثر اپنے مخصوص پروگراموں میں لالہ رُخ کے نغمے سنتے رہتے ہیں! سکون بخش مواد کی خاطر! یہ کوئی جان لینے کی کوشش نہیں کر رہا ہے کہ ایک بیٹی نے ہندو کے ساتھ شادی کیوں کی ہے؟ شاید اس لیے کہ فنونِ لطیفہ سے تعلق رکھنے والوں کی یہ پہلی ہندو مسلمان کی شادی تو ہے نہیں۔؟!۔!؟

اور اگر کسی نے بھی، آج تک، مذہب کے نام پر سازش رچ کر، اپنی ماں یا نانی کو قتل کر کے اپنا نام دینے کی کوشش کی ہوتی تو لالہ رُخ کا قتل ہو سکتا تھا! یعنی موقعے کا فائدہ اٹھا کر لالہ رُخ کا ہندو نواسہ اُس کا اپنے دھرم کے طریقے سے ایک مسلمان کو سپردِ آتش کر سکتا تھا! ایسا تاثر مجھے میرے ہم سفروں نے دیا تھا! اور ان کے منصوبوں اور ارادوں کی کیفیت بھانپ کر میں یہ سمجھ گیا تھا کہ کروڑوں روپے کی لاگت سے تیار کی گئی، لالہ رُخ کو عارفہ بنا کر، وادی میں دفن کرنے کی سازش اگر کامیاب ہو جائے تو یہ وادی کے دشمنوں کی منظم سیاسی جیت ہوگی!

اچانک ایک زور کا جھٹکا محسوس کرتے ہوئے میرے خدشات اور یادداشت کے سلسلے لرز کر بکھر گئے! اور میں منظر دیکھ کر کانپ اُٹھا!

ایک مکمل طور پر برف سے ڈھک چکے جزیرے کے بارے میں ایک جدید ترین ہیلی کاپٹر میں بیٹھے چند کھوجی افسران نے اپنے ساتھ آئے چھ عدد ہیلی کاپٹروں میں بیٹھے اپنے عملے کو، جن میں میڈیکل ٹیم بھی شامل تھی، یہ ہدایات دیں کہ کوئی جزیرے پر اُترنے کی کوشش نہ کرے! وجہ یہ بتائی گئی کہ جزیرے کے بارے میں معلومات حاصل نہیں ہیں! آس پاس کوئی بحر ہے یا خلیج؟ یہ بھی معلوم نہیں! کیونکہ دور بینی نظریں، طاقتور مصنوعی روشنی کے باوجود ہر منظر دھند یا کہر کی چادر اوڑھ کر وجود کو محسوس کرتے ہوئے بھی خدا کے وجود کے طرح نظر نہیں آتا ہے۔ یہ احساس دلایا گیا کہ یہ کسی علامتی یا کسی انہونی واردات کا اشارہ ہوسکتا ہے کیونکہ باہر کی حرارت منفی بیس ڈگری سلیسیس ہے جو اور بھی گر سکتا ہے! ہمیں انتظار کرنا پڑے گا- ایک امید کے سہارے کہ ہم سب کی دعا قبول ہو اور ہمیں دنیا بنانے والا زندہ رکھے جب تک ہمارا رابطہ بحال ہو سکے! لیکن ہمیں مشن کو پورا کرنے کی خاطر یہاں رُک جانا پڑے گا ورنہ جواب طلبی ہوگی!

میرے ہم سفروں نے مجھے نیچے اُتر کر عارفہ کو تلاش کرنے کا حکم دیا! وہ اس لیے کہ میں ہی اپنی لالہ رُخ کی تلاش کر سکتا ہوں وہ اس لیے کہ جن اجنبی ہم سفروں نے جس کو کبھی دیکھا نہیں ہے وہ اُس کی شناخت کیسے کر سکتے ہیں؟! یہ دیکھ کر مجھے یقین ہو گیا کہ مجھے اپنے ساتھ لانے کا مقصد کیا تھا!-؟!

جزیرے پر پھسل کر چلتے ہوئے مجھے ٹھٹھرتے ہوئے دیکھ کر کھوجی ٹیم کا سربراہ مجھے ایک لائف جیکٹ دے کر، میرے ساتھ جہاز کا بلیک بکس کھول کر، یہ جان گیا ہے کہ جہاز کو جزیرہ پر اُتارا تو گیا تھا مگر سرد ہواؤں کی وجہ سے کوئی بچ نہیں پائے گا! یہ خدشہ ظاہر کیا گیا تھا-!!

میں نے ٹھٹھرتے ہوئے ہاتھوں سے کیمرے کو دھندلی نگاہوں سے چارسو دیکھا

تو ایک شیشے کے مانند قالب میں اپنی لالہ رُخ کو پہچان لیا! میں نے فوٹو کھینچ کر اپنے ہم سفروں کو یہ اطلاع دی کہ ہماری لالہ رُخ نے وادی کے صوفی سنتوں کی طرح اپنے جسم کو برف میں ڈال دیا ہے!

ایک گرج دار آواز نے ٹوک کر کہا-نہیں- ہم مرحومہ کو جزیرہ میں دفن کرنے کے بعد لوٹ کر جارہے ہیں! وادی کے لوگوں کو اطلاع دینے کی خاطر! فوری طور پر!!

میرے ہم سفر جو میرے ہم نوا ہونے کے فرضی واقعات بنانے میں مصروف تھے جبکہ اُن کے قہقہوں کی آڑ میں، اُڑان کے دوران، میں اپنے کیمرے، اپنی مادری زبان میں، صداقت کو بیان کرنے میں کامیاب ہو چکا ہوں اور سوچ رہا ہوں کہ اگر وہ مجھے قتل بھی کردیں گے تب بھی وہ میرے کیمرے میں قید کی گئی تصاویر کے ساتھ میری آواز سُن کر، ایک سنسنی خیز حقیقت سے آشنا ہوں گے! اور اگر ایسا ہوا تو شاطر حملہ آور کا چہرہ ویسے ہی نظر آجائے گا جیسے شیطان کے کرتوت!!

میری آواز ہماری مادری زبان میں ہے، میرے ہم سفروں کے فاتحانہ قہقہوں میں ایک بچے کے رونے کی آواز کی طرح! کوئی ماں میری باتوں کا مفہوم سمجھ پائے اس لیے میں بار بار بولتا رہا! اور بولتا رہوں گا- اور بول رہا ہوں!

''میرے ہم وطنو!- میں اپنی لالہ رُخ کو دیکھ کر آیا ہوں-! بہہ رہی دریا کی موجوں کے ساتھ ہمارے گھاٹ تک آنے والی فاطمہ چاچی کی لاڈلی عارفہ نے اور میری ماں کی دُلاری رادھا نے ایک نامعلوم جزیرے میں، برف میں، اپنا جسم بند کردیا ہے! غالباً یہ سوچ کر کہ دنیا بنانے والا خود کفن کے بندھ کھول دے گا! جو جشن منارہے ہیں! وہ نہیں ہیں ہمارے ہم سفر بلکہ وہ ہمارے خود ساختہ چارہ گر ہیں اور ہمارے کرب سے

بے خبر! -اصل میں وہ ہیں ستمگر!! گویا ہمارے نوحہ گر ہیں آنسوؤں کے سوداگر!!

میں شاید آپ کو مل نہیں پاؤں گا! -اس لیے کہ کیمرہ چھین کر مجھے مار ڈالیں گے

میرے ہم سفر! مجھے فخر ہے کہ میں لالہ رُخ کو بچپن سے جانتا ہوں! -اور میں ان کے نغموں کو آخر دم تک گنگناتا رہا ہوں گا!

اُس سے زیادہ فخر اس بات کا کہ میں حسن نانوائی کو بھی جانتا ہوں!

وہ نہ ہوتے تو ہماری لالہ رُخ بھی نہ ہوتی!!

☆☆☆

لال پُل کا دیوانہ

دیپک کنول

جمیل خان اوڑی کا باسی تھا۔ اوڑی کے ساتھ جو ندی بہتی ہے اُس پر جو پل بنا ہے اُسکا نام لال پل ہے۔ یہ پل کشمیر کے دو حصوں کو آپس میں جوڑ دیتا ہے۔ اس پل کے ساتھ جمیل خان کو والہانہ لگاؤ تھا۔ کبھی وہ پل کے اُس پار نہارتا رہتا تو کبھی وہ اس پل کے نیچے بہنے والی ندی کے پانی کے ساتھ کھیلنے لگتا تھا۔ یہ شیتل اور خاموش ندی ہمالیہ کے پہاڑوں سے برف چوس کر پھوئیاں پھوئیاں آگے بڑھتی تھی۔ آگے بڑھتے بڑھتے اس میں چھوٹے چھوٹے ندی نالے مل جاتے تھے اور یہ ندی ایک وشال روپ اختیار کر لیتی تھی۔ یہ ندی بڑی سبک رفتاری کے ساتھ کھیت کھلیانوں کی پیاس بجھاتے، لوگوں کا میل دُھلاتے، سلام آباد کی مٹی کو چومتے ہوئے ایک محبوبہ کی طرح خرام ناز کے ساتھ لہراتے بل کھاتے بہتی رہتی تھی اور پھر آگے جا کر وہ اپنے محبوب دریائے جہلم کی آغوش میں سما جاتی تھی۔

جمیل خان بھی ندی کے اس پار اپنے محبوب کے دیدار کے لئے گھنٹوں کھڑا رہتا تھا۔ اُس کی ایک جھلک پانے کے لئے اُس کی آنکھیں انتظار کرتے کرتے پتھرا جاتی تھیں۔ وہ بھی بڑا ضدّی تھا۔ جب تک وہ ندی کے اُس کنارے پر اپنا جلوہ نہیں دکھاتی تھی وہ وہاں سے ہٹتا نہیں تھا۔ جب وہ خرام ناز کے ساتھ ندی کے کنارے پر آجاتی تھی تو جمیل خان کو دل کی دھڑکنیں تیز ہو جاتی تھیں۔ چہرہ مارے خوشی کے شفق کی مانند کھلنے لگتا تھا۔ وہ والہانہ نظروں سے اُس کی جانب دیکھتا تھا۔ اُس کی جھلک دیکھ کر وہ انتظار کی ساری کوفت بھول جاتا تھا۔ جب اُس کے گلابی ہونٹوں پر تبسم کِھلتا تھا تو اس کی یہ ایک مسکراہٹ اُس کے دل کو امیدوں اور خوشیوں کے اُجالوں سے بھر دیتی تھی۔ وہ خوشی سے لہر بہر ہو کر لوٹ

جاتا تھا اور پوری رات اُسی ایک مسکراہٹ کی گرمی اور لطافت کے ساتھ جی لیتا تھا۔ وہ مسکراہٹ جو اُسکے تخیل کے آکاش پر کہکشاں بن کر دیکھتی رہتی تھی۔

جمیل خان ایک کوہستانی گوجر تھا۔ اوڑی کا قصبہ جو کہ چارسُو پہاڑوں سے گھرا ہوا ہے اُنہیں پہاڑوں میں سے ایک پہاڑی پر اسکا نشیمن تھا۔ مرغے کی کلغی کی طرح کھڑی پہاڑی پر اُسکا ڈھوکا تھا۔ اس پہاڑی کے دامن میں کئی گاؤں تھے جن میں سلام آباد اس لئے اہم تھا کہ اُس پار کے علاقے سے جو بھی سیلانی یہاں آتا تھا اُسے سلام آباد میں اُتر کر اپنی پہچان درج کرانی پڑتی تھی ۔ جمیل خان اکثر سودا سلف خریدنے کے لئے سلام آباد آتا جاتا رہتا تھا۔ اب تو آوا جائی کچھ زیادہ ہی ہوگئی تھی۔ وہ پار سے آنے والے سیلانیوں کا اس قدر مونس بن گیا تھا کہ جو بھی وہاں سے آتا تھا وہ اُس سے ہاتھ ضرور ملاتا تھا۔ شاید وہ اُن سے مل کر اُس پار کی سوندھی سوندھی مہک و نکہت سے سرشار ہونا چاہتا تھا جہاں اُسکی محبوبہ رہتی تھی۔

جمیل خان ایک بانکا نوجوان تھا جسکی پتلی سی داڑھی، اس کے معصوم چہرے پر بڑی بھلی لگتی تھی۔ وہ پچھلے دو سال سے اکیلے ہی ڈھوکے میں رہتا تھا۔ اکیلا ہنستا تھا بھلا نہ روتا۔ باپ برسوں پہلے ایک حادثے میں جان بحق ہوگیا تھا۔ ایک ماں تھی جس نے اُسے پال پوس کر بڑا کیا تھا۔ دو سال قبل وہ بھی پیوند خاک ہوگئی تھی۔ ماں کے انتقال کے بعد وہ ایک دم اکیلا ہو کے رہ گیا تھا۔ کئی گوجر گھرانوں سے اُسکے لئے رشتے آنے لگے مگر جمیل تو شادی کے لیے راضی ہی نہ ہوا۔ رشتے ناتے داروں نے سمجھایا کہ جمیل خان شرمیلا ہے۔ ابھی نانا کر رہا ہے۔ کچھ دن بعد خود ہی راضی ہو جائے گا مگر ایسا ہوا نہیں۔ اُنہوں نے اُسے بڑا منایا، بڑا سمجھایا مگر وہ تو ٹس سے مس نہ ہوا۔ آخر اس انکار کی وجہ کیا ہے یہ کوئی سمجھ نہیں پا رہا تھا۔ جنہیں پرواہ تھی اُنہوں نے بہت کھوجا کھنگالا، پر کچھ ہاتھ نہ لگا۔ یہ بات کوئی نہیں

جانتا تھا کہ جمیل کسی کو دل دے چکا ہے اور اُسی کی یاد میں رات دن آہیں بھرتا رہتا ہے۔

ہوا یوں کہ بکروال یار محمد کے بیٹے شاہ محمد کی شادی طے ہوئی تھی۔ اُس کا چھوٹا بھائی دوست محمد ندی کے اُس پار پاکستان والے کشمیر میں اپنے عیال کے ساتھ کئی دہائیوں سے رہ رہا تھا۔ دونوں بھائی ایک دوسرے سے ملنے کے لئے کب سے تڑپ رہے تھے۔ اب اللہ نے موقع بخشا تھا ملنے کا کیونکہ ریاستی سرکار نے رشتہ داروں کے ملنے جلنے کے قواعد بہت حد تک نرم کر دیئے تھے۔ سو یار محمد نے اپنے چھوٹے بھائی کو اس تقریب میں مع اہل وعیال کے شامل ہونے کیلئے مدعو کیا تھا۔ برسوں سے بچھڑے بھائی ایک دوسرے سے ملنے کے لئے کس قدر تڑپ رہے تھے اس کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ شاہ محمد روز سلام آباد کے چیل نالے پر کھڑا اپنے بھائی کی آمد کا انتظار کرتا رہتا تھا۔

آخر اُس کی یہ بے چینی، انتظار کا کرب اُس دن ختم ہوا جس دن اُسے یہ خبر ملی کہ اُس کا بھائی اپنے عیال کے ساتھ ایک ہفتے کے بعد آ رہا ہے۔ شاہ محمد کی خوشی ناقابل بیان تھی۔ وہ تو جیسے ہوا کے دوش پر اُڑا جا رہا تھا۔ جس دن دوست محمد کی آمد آمد تھی اُس دن بستی کے بچے، بوڑھے، جوان سب لال پل کے پاس جا کر جمع ہو گئے۔

لال پل پر تو جشن کا سا سماں تھا۔ انہوں نے دوست محمد اور اُس کے عیال کا سواگت کھلے دل سے کیا۔ اُن پر گلباری کی۔ پٹاخے چھوڑے۔ ڈھول پیٹے۔ وہ اس کے اہل وعیال کو جلوے کی شکل میں شاہ محمد کے ڈھوکے تک لے گئے۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے شادی شاہ محمد کی نہ ہو بلکہ دوست محمد کی ہو۔ آخر اُس کی اتنی تکریم ہوتی کیوں نہیں وہ بھی تو اسی دھرتی کا لال تھا۔ وہ بھی اسی مٹی کے خمیر سے اٹھا تھا۔ اس بھیڑ میں جمیل خان بھی شامل تھا۔ وہ بھی خوشی سے ناچ رہا تھا۔

دوست محمد کا عیال زیادہ بڑا نہ تھا۔ دو بیٹے اور ایک بیٹی تھی۔ سب سے بڑی ایک بیٹی تھی جس کی عمر سترہ اٹھارہ سال کی تھی۔ ایک دم نوخیز کلی تھی جو عنفوانِ شباب میں قدم رکھ چکی تھی۔ باقی کے بچے دس سال سے کم ہی تھے۔ بیٹی جس کا نام گل افروز تھا، بڑی نازک اندام تھی چھریرے بدن اور سانولے رنگ کی گل افروز یہاں کی عام لڑکیوں جیسی ہی تھی۔ اُس میں ایسی کوئی خاص بات نہ تھی جو اُسے یہاں کی لڑکیوں میں ممتاز بنادیتی سوائے اس کے کہ وہ بڑی چلبلی اور غصہ والی تھی۔ اس کی ناک پر ہردم غصہ رہتا تھا۔ جمیل خان کی ملاقات گل افروز سے تب ہوئی جب وہ ایک جنگلی پیڑ پر شہد اتارنے کے لیے چڑھ گئی تھی کہ مدمکھیوں نے اُس پر ہلّہ بول دیا۔ جب مدھومکھیوں نے اس پر پے در پے ڈنک مانے شروع کئے تو وہ درد کی شدت سے چیخنے چلانے لگی۔ اتفاق کی بات ہے کہ جمیل خان آس پاس ہی اپنا گلہ چرا رہا تھا۔ اُس نے جب کسی کی رونے چیخنے کی آواز سنی تو اُس سے رہا نہ گیا۔ لاٹھی لے کر اُس نے گل افروز کو شہد کی مکھیوں کے نرغے سے پہلے باہر نکالا اور پھر اُسے اپنے کاندھے پر اُٹھا کر گلے تک لے آیا۔ وہ ہمیشہ اپنی پگڑی میں ایک سوئی چھپا کے رکھتا تھا کیونکہ آئے دن اسے ان مکھیوں سے پالا پڑتا تھا۔ اس نے سوئی لے کر گل افروز کے چہرے سے اس کے ہاتھوں سے سارے زہریلے کانٹے نکال دئے۔ اس کام میں اسے بلا کی مہارت حاصل تھی۔ تھوڑی ہی دیر میں گل افروز کی پیڑھ کم ہوگئی اور وہ جمیل خان کا شکریہ ادا کر کے اپنے ٹھکانے پر چلی گئی مگر جمیل خان کو ایک انوکھی بے قراری دے گئی۔ گل افروز کے ایک لمس نے اُسے ایک انجانی لذت و مسرت سے آشنا کر دیا تھا۔ وہ اُس پل کو یاد کرنے لگا جب اس کے ہاتھ گل افروز کے بدن کو چھونے لگے تو اس کے رگ و پے میں جیسے بجلیاں دوڑنے لگی تھی۔ وہ سوچنے لگا کہ ایسا کیوں ہوا۔ اس سے پہلے بھی اس نے مختہ موسی کے چہرے چھوا تھا۔ آمنہ خالی کے بدن کو ہاتھ لگایا تھا۔ سکینہ آپا کے بدن سے کانٹے نکالے تھے

تب اسے اس لذت کا احساس کیوں نہیں ہوا تھا۔ تب اس کے تن بدن میں ہل چل کیوں نہیں مچی؟

پہلی بار وہ ایک عورت کے لمس سے آشنا ہوا تھا۔ پہلی بار اس کی انگلیاں ایک عورت کے بدن کو چھوتے ہوئے جذبات کا رس ٹٹولنے لگی تھیں۔ وہ رات اس نے گل افروز کے خیالوں میں کھو کر گزار دی۔ اگلے روز وہ صبح سویرے ہی اسے دیکھنے یار محمد کے کوٹھے پر پہنچ گیا۔ وہ باہر آ گئی۔ اس کی ایک نگاہ نے جیسے مسیحائی کا کام کر دیا۔ اس کی ایک نگاہ نے اسے فرحت و شادابی بخشی۔ جمیل خان کو جیسے جہاں بھر کی خوشیاں مل گئیں۔ گل افروز جب تک یہاں رہی وہ اپنا کام دام چھوڑ کر اس کے اردگرد بھنورے کی طرح منڈلاتا رہتا تھا۔ گل افروز باہر سے جتنی ترش نظر آتی تھی اندر سے وہ اتنی ہی نرم و ملائم تھی۔ وہ جب اکیلی ہوتی تھی تو اس کا چہرہ تنا ہوا رہتا تھا لیکن جونہی جمیل خان آ جاتا تھا اسکی تندی میں حلاوت گھل جاتی تھی۔ اس کا چہرہ خوشی سے دمک اٹھتا تھا۔ وہ جب جمیل خان کو دیکھ کے پہلی بار مسکرائی تھی تو جمیل خان کو ایسا لگا تھا جیسے گل افروز نے اس کے دل کی دہلیز پر افشاں چھڑک دی ہو۔ جیسے اس کی تاریک راہوں میں چراغ روشن کئے ہوں۔ جیسے اس کے خوابوں میں رنگ بھر دیئے ہوں۔

ہفتے عشرے کے بعد وہ اپنے ماں باپ کے ساتھ واپس اپنے وطن لوٹ گئی۔ دونوں اداس اور افسردہ تھے، پر وہ اپنے دل کی کیفیت بیان نہیں کر سکتے تھے۔ وہ بس آنکھوں ہی آنکھوں سے اپنے غم و یاس کو بیان کرتے رہے۔ جانے سے پہلے وہ ایک بار چھپ کے ملے۔ دونوں خاموشی سے ایک دوسرے کو نہارتے رہے۔ زبان سے تو کچھ بیان نہ کر سکے البتہ آنکھوں ہی آنکھوں سے انہوں نے بہت سارے عہد و پیماں ایک ساتھ کر ڈالے۔ یہ ملن کی گھڑی ایک ہوا کے جھونکے کی طرح گزر گئی۔ پھر وہ دونوں ایک دوسرے سے جدا ہو گئے۔

وہ تو چلی گئی مگر جاتے جاتے وہ جمیل خان کے دل میں محبت کی قندیل روشن کر کے گئی تھی۔ جاتے وقت جمیل خان نے اسے تحفے کے طور پر ایک کنگھی، سرمہ دانی، اور عطر کی شیشی پیش کی تھی۔ یہ ساری چیزیں اُس نے چپکے سے رکھ لی تھیں۔ بدلے میں اُس نے جمیل خان کو ایک دلفریب مسکراہٹ دی تھی۔ ایک ایسی مسکراہٹ جس میں محبت کے اُجالے پنہاں تھے۔ جس میں پیار کا رس بھرا تھا۔ جس میں چاہت کے کتنے ہی ان سنے نغمے پوشیدہ تھے۔

جمیل خان نے اس مسکراہٹ کو اپنے دل کے نہاں خانوں میں چھپا لیا۔ اس ایک مسکراہٹ نے اُس کے دل کے اندھیاروں میں محبت کے اُجیارے بھر دئے تھے۔ وہ اس ایک مسکراہٹ کے سہارے جی رہا تھا۔ وہ ہر روز ندی کے کنارے جا کر بیٹھ جاتا تھا اور اپنے محبوب کی ایک جھلک پانے کے لئے گھنٹوں ٹکٹکی باندھے ندی کے اُس اور دیکھتا تھا جہاں گل افروز رہتی تھی۔ گل افروز جو اس کی آنکھوں کے راستے سیدھے اُس کے دل میں جا کر بس گئی تھی۔

جمیل خان ان پڑھ آدمی تھا۔ وہ سیاست کے کھیل نہیں سمجھتا تھا۔ وہ آج تک یہ نہیں سمجھ پایا تھا کہ ندی کے دونوں پاٹ ایک جیسے ہیں پھر وہ اُس پاٹ تک کیوں نہیں جا سکتا۔ اُسے وہاں تک جانے کے لئے سرکار سے اجازت لینے کی ضرورت کیوں ہے۔ وہ آج تک اس گورکھ دھندے کو سمجھ نہیں پایا تھا کہ جب یہ زمین کا خطہ ایک ہی ہے تو پھر بیچ میں یہ دیوار کیوں؟ اس ندی کے آر پار دو ملکوں کی فوجیں بندوقیں تانیں کیوں کھڑی رہتی ہیں؟ کیوں یہاں پر آنے جانے والوں سے فوجی باز پرس کرتے ہیں؟ وہ یہ بھی سمجھ نہیں پایا تھا کہ ایک ہی چہرے کی دو آنکھیں بھلا الگ الگ کیسے ہوتی ہیں۔ دائیں آنکھ اپنی اور بائیں آنکھ پرائی۔ وہ تو بہت ہی سیدھا سادا انسان تھا۔ وہ تو محبت کرنا جانتا تھا۔ وہ سیاست کرنا نہیں جانتا تھا۔ وہ کہاں جانتا تھا کہ دونوں ملکوں نے محبت کے جذبے پر اتنی ساری پرتیں چڑھا رکھی ہیں

کہ ان پرتوں کو کھولنے کے لئے کئی صدیاں درکار ہیں۔ وہ ان رقابتوں سے بے خبر تھا۔ اس کے لیے تو اُس کی دنیا ایک کوہستان سے شروع ہوتی تھی تو دوسرے پر جا کر ختم ہو جاتی تھی۔

اُسے گل افروز شدت سے یاد آ رہی تھی۔ جب بھی اُس کی صورت اُس کے تصور کے کینوس پر ابھر آتی تھی تو اس کا کلیجہ منہ کو آنے لگتا تھا۔ اُس کا جگر برمانے لگتا تھا۔ وہ درد کی شدت سے تڑپنے اور کلبلانے لگتا تھا۔ جس طرح چاند کے بنا چکور ادھورا ہے اسی طرح وہ بھی گل افروز کے بنا اپنے آپ کو ادھورا اور بے معنی تصور کرنے لگا تھا۔ وہ اس کے پاس جانا چاہتا تھا۔ اُس سے ڈھیر ساری باتیں کرنا چاہتا تھا۔ پر وہ جا نہیں سکتا تھا کیونکہ اس کے پاس پار جانے کے کاغذات نہیں تھے۔ جب اُس کا صبر جواب دینے لگا تو ایک روز دیوانگی کے عالم میں اس نے لال پل پار کرنے کی کوشش کی۔ وہاں پر پہرہ دے رہے فوجی نے اُسے پکڑ کر اپنے افسر کے سامنے لا کر کھڑا کر دیا۔ اس افسر کی لمبی لمبی مونچھیں تھیں۔ اُس کی مونچھیں دیکھ کر جمیل خان ڈر گیا۔ اُس نے اپنی مونچھوں پر تاؤ دے کر اس سے تحکمانہ انداز میں پوچھا۔

''کیوں بے۔ کتھے جا رہا ہے تو؟''

''صاحب جی ہم اُس پار جانا چاہتے ہیں۔ وہ ماری گل افروز اُت بس دی ہے۔ منے اُس دی وڈی یاد آ رہی ہے۔ منے جان دو صاحب جی۔ رب تھارو بھلو کرے گو''

''اوئے تو پاگل ہو گیا ہے کیا۔ تینوں پتا نہیں کہ وہ دشمن دا علاقہ ہے۔ تو بنا کاغذ پتر کے اُتھے کیسے جا سکدا ہے۔ تیرے کول پاسپورٹ شاسپورٹ ہے کیا؟''

''وہ کے بھلا ہے صاحب جی؟''

''وہ اگر بھلا ہے تو سب سے وڈی بھلا تو تو ہے۔ جا اس ویلے اپنے کار جا۔ کل جا کے تحصیل دار کے دفتر میں جا۔ تحصیل دار نال گل کر۔ وہ تینوں اُس پار جان کی اجازت

دیں گے۔ تاں ہی تو اُتھے جاسکدا ہے۔ جا ابھی اتھے سے چلا جا''۔

جمیل خان نے فوجی افسر کو بہت سمجھایا۔ اُسے اللہ مولا کا واسطہ دیا مگر وہ ٹس سے مس نہ ہوا۔ وہ تو اُسے بنا سرکاری اجازت کے پار جانے کی اجازت دینے کے لئے تیار ہی نہیں ہوا۔ وہ بڑا مایوس اور دل برداشتہ ہو کر وہاں سے چلا۔ وہ اپنے ایک رشتہ دار دلنواز خان سے ملا اور اس معاملے میں اس سے صلاح مانگی۔ دلنواز نے اسے ڈراتے ہوئے کہا۔ ''کدی ایسی بھول مت کرنا۔ بنا اجازت نامے کے اس پار جان کی کوشش بھی کرو گے تو یہ فوجی تنے سیدھے گولی مار دیں گے۔ کل عرضی لکھ کے تحصیلدار کے دفتر میں جا اور اس سے گل بات کر۔ منے پکو یقین ہے تنے اجازت مل ہی جائے گو''۔

اگلے روز وہ تحصیل کے دفتر میں چلا گیا۔ وہاں اُس سے کسی نے سیدھے منھ بات تک نہ کی۔ انہوں نے اُسے ایک کونے سے دوسرے کونے تک ایک بھوکے کتے کی طرح دوڑایا۔ کسی نے اس کی باتوں پر کان تک نہیں دھرا۔ پورے دن تحصیل دفتر کی خاک چھاننے کے بعد نتیجہ وہی ڈھاک کے تین پات نکلا۔ کوئی اس کی بات سمجھ ہی نہیں پایا۔ وہ تو اپنے دل کی آواز ان کے کانوں تک پہنچانا چاہتا تھا مگر انہوں نے تو اپنے کان ہی بند کر رکھے تھے۔ انہیں تو دل کی باتوں سے کوئی مطلب ہی نہیں تھا۔ انہیں انسانی جذبات سے کوئی سروکار نہیں تھا۔ وہ تو بس ثبوت مانگ رہے تھے۔ بے جان کاغذوں پر لکھی ہوئی عبارت میں انہیں سچائی نظر آتی تھی جب کہ نہ انہیں اس کے جذبات کی صداقت اور پاکیزگی دکھائی دے رہی تھی اور نہ اس کے دل کی ندا سنائی دے رہی تھی۔

جب مایوسی شکست میں تبدیل ہو جاتی ہے تو انسان یا تو اپنی شکست تسلیم کرتا ہے یا بغاوت پر اُتر آتا ہے۔ جمیل خان بھی بغاوت پر اُتر آیا۔ اُس نے طے کر لیا کہ چاہے اُس کی جان رہے یا جائے وہ رات کے وقت چوری چھپے ندی پار کرلے گا اور کسی بھی قیمت پر گل

افروز تک پہنچ جائے گا۔ یہی فیصلہ کر کے وہ ایک روز شب کی تاریکی میں فوجیوں سے نظر بچا کر ندی میں اُتر گیا اور پھر تیرتے ہوئے دوسرے کنارے تک پہنچ گیا۔ جب وہ اُس پار پہنچا تو اس نے خوشی واطمینان کی سانس لی اور تیز تیز قدموں کے ساتھ آگے بڑھنے لگا۔ اچانک اس پر کسی نے بندوق کے بٹ سے حملہ کر دیا۔ حملہ اتنا زبردست تھا کہ وہ چکرا کے دور جا کے گرا اور پھر وہ بے ہوش ہو گیا۔ اسے جب ہوش آیا تو اس نے اپنے آپ کو ایک فوجی غار میں پایا۔ اس کے گرد کئی سپاہی بندوقیں تانے کھڑے تھے اور اس کی طرف خونخوار نگاہوں سے اسے گھور رہے تھے۔ اتنے سارے فوجیوں کو اپنے سر کے اوپر کھڑے پا کر اس کا دل بیٹھا جانے لگا۔ اسے دلنواز خان کی بات یاد آنے لگی کہ اگر وہ پکڑا گیا تو وہ اسے سیدھے گولی مار دیں گے۔ وہ اس خیال سے ہی بدحواس ہونے لگا۔ ایک فوجی نے اسے ایک زور کی ٹھوکر مار کر پوچھا:

''بول کس ارادے سے یہاں آیا ہے؟''

''جناب منے کیوں مار رہے ہو۔ میں کوئی چوری کرن واسطے ات نہیں آیا ہوں۔ میں تو گل افروز کو ملن واسطے آیا ہوں۔''

''گل افروز تمہاری اماں لگتی ہے کیا؟ کس بات کی جاسوسی کرنے بھیجا ہے؟''

''جناب میں کوئی جسوس نہیں۔ میں تو جمیل خان ہوں۔ وہ پار میرو کوٹھو ہے۔ وہ میں دوست محمد کی چھوکری سے ملن واسطے آ گئیو تھو کہ تھارے فوجی نے پکڑ کرات لے کے آ گئیو۔ مارو یقین کر لو جناب۔ میں کدی جھوٹ نہیں بولتو۔ مارو یقین نہیں تو گل افروز سے ہی جا کر پوچھ لونا۔ ماری بات جھوٹ نکلے تو منے گولی مار دو۔''

فوج کے جاسوسوں نے گل افروز کو کھوج نکالا۔ اُس سے تحقیقات کی تو پتہ چلا کہ

جمیل خان جو کچھ بھی کہہ رہا تھا سچ تھا۔ انہوں نے سچ جاننے کے بعد بھی اسے رہا نہیں کیا بلکہ اُس کو لے کے ایک سازش تیار کی گئی۔ وہ جان گئے تھے کہ اس کی جان گل افروز کی سانسوں کے ساتھ جڑی ہے۔ انہوں نے گل افروز سے اس کی ملاقات کروائی۔ گل افروز نے جب اسے فوجی بیرک میں دیکھا تو خوشی کے ساتھ ساتھ اسے حیرت بھی ہوئی۔ وہ اسے دیکھ کر خوشی سے رو پڑا۔ بولا۔ ''تھارے واسطے سر پہ کفن باندھ کے میں ات آ گیا ہوں۔ منے دس مارے ساتھ چلن واسطے تیار ہو کہ نہیں۔''

وہ پس و پیش میں پڑ گئی۔ وہ ابھی اتنی خود مختار نہ تھی کہ اپنے اور سے کوئی فیصلہ لیتی۔ اُس نے اُسے سمجھاتے ہوئے کہا۔

''مارے ہتھ وچ کچھ بھی نہیں ہے۔ میرے نال نکاح کرن واسطے تنے مارے باپ نال گل بات کرن پئے گی۔''

جمیل خان گل افروز کے لئے کچھ بھی کرنے کے لئے تیار تھا مگر وہ یہ نہیں جانتا تھا کہ اس کی رہائی شرطیہ ہے۔ اسے سب سے پہلے فوجیوں کا کچھ سامان لے کر واپس اپنے علاقے میں جانا تھا۔ اس کے بعد اسے گل افروز کے باپ سے ملنے کی اجازت کا وعدہ تھا۔ محبت کا دیوانہ کچھ بھی کرنے کے لئے تیار تھا۔ اس پار کے فوجیوں نے اسے کچھ سامان باندھ کے دے دیا اور اس سے کہا کہ اس پار ایک آدمی اس کے گھر سے یہ سامان لے کے جائے گا۔ ایک رات انہوں نے اسے اس پار دھکیل دیا۔ شومئی قسمت وہ اس بار یہاں کے پہریداروں کے ہتھے چڑھ گیا۔ جب انہوں نے سامان کھول کے دیکھا تو جمیل خان کے چہرے کا رنگ اُڑ گیا۔ وہ اپنے ساتھ موت کا سامان لے کر آ گیا تھا۔ اس کے سامان میں بندوقیں اور گولیاں بھری پڑی تھیں۔ اس کے ساتھ بہت بڑا دھوکہ ہوا تھا پر اس کی بات کا کون یقین کرتا۔ اس بار یہاں کے پہریدار نے اسے الٹو کر کے مارا۔ چار چوٹ کی مار کھانے کے بعد وہ بے ہوش

ہو گیا۔ اسے جب ہوش آیا تو وہ ایک کال کوٹھری میں بند تھا اور اس کے گرد بہت سارے فوجی کھڑے تھے۔ وہ کھود کھود کر اس سے پوچھنے لگے کہ وہ یہ گولی بارود کسے پہنچانا چاہتا تھا۔ اسے تو کچھ بھی معلوم نہیں تھا۔ اسے پار والوں نے جو کچھ کہا تھا وہ تو یہی سب کچھ انہیں بتا رہا تھا مگر وہ اس کی بات سننے کی بجائے اسے مارتے چلے جا رہے تھے۔

وہ کئی دن فوجیوں کی مار کھاتا رہا۔ ایک ہفتے کے بعد اسے پولیس کے حوالے کیا گیا۔ اس پر دہشت گردی کا الزام تھا۔ وہ اپنی قسمت پر روتا رہا۔ اس کے رشتہ دار دلنواز خان نے اسے چھڑانے کے لئے کافی دوڑ دھوپ کی مگر اس کی کوشش بار آور ثابت نہ ہوئی۔ جمیل خان پر دہشت گردی کا سنگین الزام لگا تھا جس میں چھوٹنے کے چانس بہت کم تھے۔ ایک رات وہ حوالات کی کوٹھری میں دہاڑیں مار مار کر روتا رہا۔ اس کی چیخوں میں اتنا درد تھا کہ حوالات کی مضبوط دیواریں بھی لرز گئیں۔

اس رات اوڑی میں بڑا زبردست طوفان آیا۔ ایسا جھال اٹھا کہ گھروں کی چھتیں تنکوں کی طرح اُڑ گئیں۔ تناور درخت جڑ سے اُکھڑ کر گر گئے۔ بجلی کے کھمبے بے جان لاشوں کی طرح سڑکوں پر بکھرے پڑے تھے۔ سڑکیں کٹ کے رہ گئی تھیں۔ ندی میں ایسا اُبھان آیا تھا کہ وہ سرکش ہو کر اپنے ہی کنارے کاٹنے لگی۔ ایک طرف موسم کی مار اور دوسری طرف قانون کی پکار۔ جمیل خان ان دونوں کے بیچ پھنس کر رہ گیا تھا کیونکہ اگلی صبح اسے عدالت میں پیش کیا جانا تھا۔

اُدھر گل افروز کو اس کی بربادی کی کہانی معلوم ہو گئی تھی۔ وہ روز ندی کنارے صبح سے شام تک بیٹھی اس کی راہ تک رہی تھی۔ ادھر اسے پولیس بند گاڑی میں بٹھا کر عدالت میں لے جانے لگی۔ راستے میں گاڑی کیچڑ میں پھنس گئی۔ اس سے پہلے کہ پولیس والے گاڑی کو نکال پاتے وہ پیچھے سے فرار ہو گیا۔ وہ وہاں سے سیدھے ندی کی طرف بھاگا اور اس نے بغیر

کچھ سوچے سمجھے ندی میں چھلانگ ماردی۔ یہ دیکھ کر اس کی خوشی کا کوئی ٹھکانہ نہ رہا جب اس نے گل افروز کو کنارے پر اُس کا انتظار کرتے پایا۔ وہ طوفانی لہروں سے لڑتا ہوا آگے بڑھنے لگا مگر اس بار ندی ایسی بھری ہوئی تھی کہ وہ جمیل خان کو اپنے ساتھ بہا کر لے جانے لگی۔ وہ گل افروز تک پہنچ نہیں پایا۔ گل افروز نے جب اسے بہتے دیکھا تو وہ بھی ندی میں کود گئی۔ دو دن بعد پولیس کو ان دونوں کی لاشیں مل گئیں۔ حیرت کی بات یہ تھی کہ وہ دونوں ایک دوسرے میں جیسے پیوست ہو کر رہ گئے تھے۔ جیسے وہ ایک دوسرے میں سما گئے تھے۔ اُن کی لاشیں دیکھنے کے لئے ساری مخلوق پولیس تھانے پر ٹوٹ پڑی تھی۔ وہ لال پل کے اس دیوانے کا ایک بار دیدار کرنا چاہتے تھے جس نے سیاست کو ایک بار پھر شرمسار کر دیا تھا۔

برف ِگرنے والی ہے

ترنم ریاض

''سرکار نے بچّوں کے کام کرنے پر پابندی عائد کردی ہے۔''ہاجرہ نے کھڑکی کے ٹوٹے ہوئے شیشے کی جگہ چاولوں کی پیچھ لگا اخبار چپکانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔

''اس سے ہوانہیں رکے گی۔کوئی گتے کا ٹکڑا تلاش کرو۔''خضر محمد نے بیوی کی طرف دیکھااور چولہے میں کل رات سے پڑی راکھ میں چلم سے بندھی ہوئی چمٹی کی مدد سے انگارہ تلاش کرنے لگا کہ تمباکو کے چوبی ڈبے میں سے اسے کچھ ادھ جلا تمباکو مل گیا تھا۔اور صبح سے اس نے حقے کا ایک کش بھی نہیں لگایا تھا۔

''تو پھر میں کیا کروں امّی۔'' جاوید دونوں ہاتھوں کوآپس میں تیزی سے رگڑتے ہوئے باری باری والدین کی طرف دیکھ کر بولا۔

''اپنے بابا سے پوچھو۔تنہااس کی محنت سے ہم چاروں کا گزارہ نہیں ہوسکتا بیٹا۔ دونوالے چاول بھی مشکل ہوجائیں گے۔''

''تم اب بچے نہیں ہو بیٹا۔ بڑے ہوگئے ہو۔میں بھی کمزور ہوگیا ہوں۔مستقل زکام سے میراسر درد کرتا رہتا ہے۔۔۔پھر تمہارے ہاتھ،انگلیاں بھی بڑی ہوگئی ہیں۔''

''مگر خواجہ صاحب تو کہہ رہے تھے کہ تمہاری انگلیوں میں اب بھی بڑی نزاکت و نفاست ہے۔تم نمونوں کے بھی ماہر ہوگئے ہو۔ابھی کچھ برس اور تم قالین بننے کا کام بہ آسانی کرسکتے ہو۔وہ میری تنخواہ بھی بڑھارہے ہیں،بابا۔''

''مگر ہم کیا کر سکتے ہیں۔ تمہیں کوئی مزدوری کا کام کرنا پڑے گا۔ یہ جو سماجی کارکنوں کا وفد تمہاری فیکٹری آیا تھا۔ وہ دوسری ملوں اور فیکٹریوں میں بھی گھوم رہا ہے۔ پھر خواجہ صاحب تو خود ڈر رہے ہوں گے تم لوگوں سے کام کروانے میں۔'' خضر محمد چلم سے بندھی چمٹی کی مدد سے چولھے میں پڑی راکھ کے نیچے دبا آخری انگارہ نکال کر چلم میں ڈالتے ہوئے بولا۔

''ہاں بیٹا۔ کچھ دن تو زور رہے گا۔ پھر شاید کچھ دیر خاموشی چھا جائے۔ یہ اجلے کپڑوں والے لوگ بڑی کھوکھلی ہمدردی جتاتے ہیں۔ کون ماں نہیں چاہے گی کہ اس کا بچہ پڑھے لکھے۔ مگر وہ کیا جانیں بھوک کیا ہوتی ہے۔''

اخبار کھڑکی پر نہیں چپک پایا تھا کہ کل رات پکے چاولوں کی پیچھ کا آخری قطرہ تک جاوید احمد نے صبح اپنی چھوٹی بہن کو چمچ سے پونچھ کر پلا دیا تھا۔ اور اخبار ٹھیک طرح سے نم نہیں ہوا تھا۔ ہاجرہ نے کاغذ موڑ توڑ کر چولہے کی طرف اچھال دیا۔

''اب کیا ہوگا۔'' اس نے پاس رکھی کانگڑی میں پڑی راکھ میں انگلی ڈال کر اُسے پیندے تک ٹٹول ڈالا۔ کانگڑی میں ایک چنگاری تک نہیں تھی۔ ساری راکھ ٹھنڈی پڑی تھی۔ گھر میں کئی دن سے کانگڑیوں کے کوئلے بھی ختم ہو چکے تھے اور لکڑی بھی تھوڑی سی رہ گئی تھی۔ چولہے کی تھوڑی بہت آگ ہی کانگڑیوں میں استعمال ہوتی تھی۔

وہ دونوں ہاتھوں کو پھرن کی آستینوں کے اندر سمیٹ کر مٹی سے پتی دیوار سے لگ کر بیٹھ گئی۔ کھڑکی کے پاس ایستادہ رہنے سے اسے سردی لگ گئی تھی اور آواز میں کپکپی پیدا ہو گئی تھی۔

''اب سب ٹھیک ہو جائے گا امی۔'' جاوید احمد یاسمین کو گود سے اُتار کر ماں کے

قریب لے گیا۔ ہاجرہ نے بچّی کو پھرن کے اندر باہوں میں سمیٹ لیا۔ ماں کے پھرن کے گریبان سے بچی نے بھی اپنا چھوٹا سا سر باہر نکالا اور ماں کے رخسار کے ساتھ سر ٹکا کر بھائی کو دیکھتی ہوئی مسکرانے لگی۔

''کیسے ٹھیک ہوگا، بیٹا۔'' ہاجرہ نے جاوید احمد کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔ خود ہاجرہ کی آنکھوں میں دونوں جہاں کی ناامیدی تھی مگر جاوید احمد کی نظروں میں قندیلیں سی روشن تھیں۔۔۔اس کی ٹھوڑی پر چند ایک سیاہ بال نمودار ہو چکے تھے اور کچھ گنتی کے کانوں کے پاس بھی اگ آئے تھے۔ اس کی ناک اور رخسار سرخی مائل تھے اور گھنے گھنے بال ابھی بھی گیلے تھے گو کہ وہ کوئی دو گھنٹے پہلے سڑک کے اس پار طویل زینہ طے کر کے جہلم میں اتر کر نہا آیا تھا۔ یہ اس کی عادت تھی۔ وہ سردی سے گھبراتا نہیں تھا۔ پھر گرم پانی اسے میسّر بھی کہاں تھا۔ ایک بالٹی گرم کرنے میں کتنا خرچہ ہو جاتا ہے۔ وہ سوچا کرتا۔

''بہت پہلے سے میرے پاس ایک کام کی دعوت ہے۔ میں نے انکار کر دیا تھا۔ مگر بابا اب کروں گا۔ بس ذرا احتیاط کا کام ہے۔ اور پیسہ ہی پیسہ۔''

جاوید احمد بالوں میں کنگھا کرتے ہوئے بولا۔

''سچ؟ پھر تم نے اب تک کیوں یہ کام شروع نہیں کیا۔ گھر میں راشن آجاتا۔ تم لوگوں کے گرم کپڑے بھی۔ برف گرنے والی ہے۔ یہ رضائی اب چھوٹی پڑتی ہے۔

ہم چاروں اس میں سماتے بھی کہاں ہیں۔ آڑی اوڑھنے کی وجہ سے تمہارے بابا تو بمشکل چھاتی تک لے پاتے ہیں اسے۔ ایک بڑا سا لحاف بنوائیں گے۔ بہت سی روئی ڈلوا کر۔'' حاجرہ کے چہرے سے کرنیں سی پھوٹنے لگیں۔

''تو پھر میں جاؤں۔ امی۔ بابا۔''

"لیکن کہاں جاؤ گے بیٹا۔" خضر محمد نے بجھی راکھ اور راکھ ہوئے تمباکو والا خالی حقہ گڑگڑایا۔

"خلیل جُو کے پاس۔۔" جاوید احمد نے مٹی کی دیوار میں پھنسائے گئے چھوٹے سے آئینے کے پُتے ہوئے حاشیے پر کہیں سے بھی نہ نظر آنے والی گرد پونچھنے کے بہانے آئینے میں ماں باپ کے چہروں کی طرف دیکھ کر کہا۔

"ارے نہیں بیٹا یہ کیا کہہ رہے ہو تم۔ خدا نہ کرے کہ تم کوئی ایسا کام کرو۔" خضر محمد نے حقہ سامنے سے ہٹا دیا۔ اور تشویش ناک نظروں سے بیٹے کی طرف دیکھنے لگا۔

"خدا کے لیے بیٹا۔ تم ایسا سوچنا بھی مت۔" ہاجرہ نے پھرن کے اندر سے یاسمین کو نکال کنول کی جڑوں کی گھاس سے بنی چٹائی پر لٹا دیا۔ اور اٹھ کر بیٹے کے قریب آ گئی۔ اس کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے تھے۔

"نہ میرے لعل۔۔ ہمارے پیٹ کے لیے اپنی زندگی مت بیچنا۔ جی لوں گی۔ تمھیں کھو کر زندہ نہ رہ پاؤں گی۔ میرے بچے۔" اس نے اپنے سوکھے لب جاوید احمد کے بالوں سے لگا لیے۔ اور پھوٹ پھوٹ کر رو پڑی۔

"ایسا نہیں ہوگا امّی۔" جاوید احمد ماں سے لپٹ کر بولا۔ اتنے لوگ تو کرتے ہیں کام۔ کتنے ہی ہیں۔ جنہیں ابھی تک کچھ بھی نہیں ہوا۔ آپ خواہ مخواہ دل ہار رہی ہیں۔ مجھ پر بھروسہ رکھیے اب میں بڑا ہو گیا ہوں۔۔"

"مگر اس میں دوسروں کی جانیں بھی تو جا سکتی ہیں اور وہ گناہِ عظیم ہے۔ اتنا بڑا خطرہ۔۔ اپنا، دوسروں کا۔۔ نہ بیٹا۔ نہ۔" ہاجرہ نفی میں گردن ہلاتی ہوئی بولی۔

"ایسامت کرنا میرے بچے۔۔"

"خلیل جو کہتے تھے ثواب ہے۔۔کچھ ہو گیا تو شہادت نصیب ہوگی۔مگر میں اپنا خیال رکھنا جانتا ہوں بابا۔۔امّی کو سمجھایئے نا۔۔" جاوید احمد کواڑ کے قریب بیٹھ کر اپنے جوتوں کا جائزہ لینے لگا۔شکر ہے ابھی برف نہیں گری۔ بائیں جوتے کا تو تلا ہی الگ ہو رہا ہے۔اسے سِلوانا ہوگا۔وہ موزے پہن کر باپ کو دیکھنے لگا۔کچھ دن بعد وہ اپنے لیے نہایت عمدہ جوتے خرید سکے گا۔جیسے خواجہ صاحب کا بیٹا پہنتا ہے۔ لمبے لمبے فیتوں والے ہلکے پھلکے سے۔

"تم۔۔تم تو میرے رحمدل بیٹے ہو۔۔یہ کام کیونکر کر سکتے ہو۔۔زندگیاں تو سب کی قیمتی ہوتی ہیں۔۔"خضر محمد بیٹے کی پیروں کی طرف دیکھتا ہوا سمجھاتے ہوئے بولا۔ پھٹے موزوں میں سے جاوید احمد کی سرخ ایڑھیاں اور انگوٹھے بچّوں کے پیروں کی سی نزاکت لیے ہوئے نظر آ رہے تھے۔

ابھی کل ہی کی تو بات ہے سرخ بیر بہوٹی سا ننھا منا وجود دائی مہرو نے خضر محمد کی بانہوں میں تھمایا تھا۔اسے خضر محمد نے بیس روپے کا نوٹ انعام میں دیا تھا۔مہنگائی بھی تو اتنی نہ تھی۔ ہاجرہ نے پچیس روپے کے اون سے اپنے منّے کے موزے، سویٹر اور ٹوپی تک بنی تھی۔

دو جوڑے موزے بھی لاؤں گا اپنے لیے۔خواجہ صاحب کے بیٹے کو کتنا لطف آتا ہوگا ایسے عمدہ جوتے پہن کر چلنے میں۔ جاوید احمد سوچ رہا تھا۔ایک دن جب فیروز میاں ظہر کی نماز کے لیے مسجد میں جاتے وقت جاوید احمد کی ہوائی چپلیں پہن گئے تھے تو ان کا جوتا پائیدان سے ہٹا کر ایک طرف رکھتے ہوئے جاوید احمد حیرت زدہ رہ گیا تھا۔اتنا

جسیم نظر آنے والا جوتا اور وزن نہ کے برابر۔ فیروز میاں چلتے کیا ہوں گے۔ اڑتے ہوں گے ہوا میں۔

"کیا سوچ رہے ہو بیٹے۔۔ بتاؤ نا۔۔ یہ کام تمہارے جیسے انسان کے لیے نہیں ہے۔۔ کچھ اور کام دیکھ لینا۔۔ دیکھتے ہیں خدا کی کیا مرضی ہے۔۔"

"کچھ دن ذرا صبر کرو۔ میں چشمہ بدل لوں گا تو باریک کڑھائی کا کام پھر سے شروع کروں گا۔۔ آمدنی بڑھ جائے گی۔۔ اس موٹی کڑھائی کے کام میں کمائی بہت کم ہوتی ہے۔۔ بس ذرا چار پیسے آجائیں تو ڈاکٹر۔۔"

"چار پیسے۔۔ کہاں سے آئیں گے بابا۔۔ بھوکے پیٹ کتنے دن اور کس امید پر انتظار کریں گے۔۔ یاسمین بھوکی مرجائے گی۔۔ جانے خواجہ صاحب کب کام پر بلائیں۔۔ بلائیں گے بھی یا کیا معلوم۔۔ پھر گزارہ کہاں ہوتا ہے بابا۔۔" جاوید احمد جوتے پہن کر کھڑا ہو گیا۔

"مگر یہ جان کا خطرہ۔۔ میرے بچے۔۔ جب جان ہی نہ رہے گی تو بھوک کیسے لگے گی۔۔ تمہارے بابا کچھ کریں گے۔۔ تم فکر مت کرو۔۔"

"جب تک جان ہے بھوک لگے گی ناں ماں۔۔ تمہیں لگی ہے نا؟ مجھے بھی لگی ہے۔۔ میں جلدی آؤں گا۔۔ تم فکر مت کرنا۔۔ جب میں آؤں گا تو گھر کا سارا سامان لے کر آؤں گا۔۔ اور مجھے آنے میں دیر ہوئی تو تم گھبرا مت جانا۔ اچھا بابا۔۔ خدا حافظ۔" جاوید احمد نے تیزی سے باہر نکل کر کواڑ بند کر دیئے اور لمبے لمبے قدم اٹھاتا بائیں جانب کی گلی میں مڑ گیا۔

"ارے بیٹا سنو تو۔۔" ہاجرہ دروازہ کھول کر باہر نکل آئی مگر شدید دھند میں اسے

جاوید احمد کا ہیولہ تک دکھائی نہ دیا۔ البتہ کہرے سے نم راستے پر اسے پھٹے تلے والے جوتوں کے گھسیٹے جانے کی سماعت سے دور ہوتی ہوئی غیر متوازن چاپ سنائی دے رہی تھی۔ دھڑکتا ہوا دل دونوں ہاتھوں سے تھام کر وہ خضر محمد کی طرف پلٹنے لگی تو وہ بھی دہلیز تک آ چکا تھا۔

"جاوید۔"

ایک پکار فضا میں ابھری تو قریب کے کسی خزاں زدہ یخ بستہ درخت کی جمے ہوئے کہرے میں لپٹی ننگی ٹہنی پر بیٹھا کوئی کوّا بولا اور اندر سے یاسمین کے رونے کی آواز آنے لگی۔

شیر اور بکرا

دیپک بُدکی

دراصل اس کا نام فاطمہ تھا مگر لوگ اس کو 'فاطی' کے نام سے جانتے تھے۔ اسی طرح اس کے خاندان کا نام اسماعیل تھا جس کا مخفف 'اسمال' ہر ایک کی زبان پر چڑھ گیا تھا۔ اب صورتحال یہ تھی کہ انہیں خود بھی اپنا اصلی نام یاد نہیں تھا لوگوں کی تو بات ہی نہیں۔

شوہر اور بیوی دو مختلف فرقوں سے وابستہ تھے۔ اسمال 'شیر' فرقے سے تعلق رکھتا تھا جبکہ فاطی کا خاندان، 'بکرا' فرقے سے تعلق رکھتا تھا۔ شیر بکرے کی یہ تفریق دو قوی اناؤں کے ٹکرانے کی عجیب داستان ہے۔ ۱۹۳۱ء سے پہلے دونوں جہلم کے ایک ہی گھاٹ پر پانی پیا کرتے تھے مگر وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ مولوی یوسف شاہ کو محسوس ہوا کہ نوخیز شیخ محمد عبداللہ اس کی مقبولیت میں سیندھ لگا رہا ہے۔ اتنے عرصے ہی میں لوگوں نے شیخ صاحب کو شیر کشمیر کے خطاب سے نوازا تھا۔ ہزاروں لوگ شدید سردی اور منفی درجہ حرارت کے باوجود اپنے محبوب راہنما کی سحر انگیز تقریر سننے کے لیے میلوں کی مسافتیں طے کر کے آتے۔ یہی وجہ تھی کہ مولو[ی] صاحب کے دل میں خدشات نے جنم لیا اور دیکھتے ہی دیکھتے شرر شعلہ بن گیا۔ دونوں کے راستے الگ ہوئے اور وہ ایک دوسرے کے خون کے پیاسے بن گئے۔ باریش مولوی کے معتقد 'بکرے' کہلانے لگے جبکہ شیر کشمیر کے پیروکار 'شیر' کہلانے لگے۔ شیخ صاحب نے جامع مسجد کو الوداع کہہ کر مجاہد منزل میں اپنی ڈیڑھ اینٹ کی الگ مسجد کھڑی کر دی۔

سرحدیں کھنچ گئیں اور ان سرحدوں پر آئے دن تناؤ رہنے لگا۔ فسادات کے دوران اگر کوئی شخص بھولے سے دوسرے فرقے کے نرغے میں پھنس جاتا تو اس کی جان کی خیر نہ ہوتی۔ شہر میں افواہیں تیزی سے گشت کرتیں۔ سرحدوں پر مورچے لگ جاتے۔ ایک

دوسرے پر سلگتی کانگڑیوں، پتھروں اور اینٹوں کی بارش ہوتی۔ کبھی کبھار آگ زنی تک نوبت پہنچ جاتی۔ دیر سویر پولیس آدھمکتی اور لاٹھیوں اور آنسو گیس سے دنگائیوں کو بھگانے کی کوشش کرتی مگر تب تک بہت نقصان ہو چکا ہوتا۔ سورج ڈھلتے ہی سڑکیں ویران ہو جاتیں۔ پھر کئی روز یہ سلسلہ یوں ہی چلتا رہتا۔

ایسے پس منظر میں اسمال اور فاطی کی شادی ایک معمہ بن کر رہ گئی تھی۔ سنا ہے دونوں ایسے محلے میں رہتے تھے جہاں ایک جانب شیروں کی آبادی تھی اور دوسری جانب بکروں کی۔ درمیان میں دس گیارہ کشمیری پنڈتوں کے مکان فصیل کا کام کرتے۔ البتہ فسادات کے دنوں میں یہی مکان بیڈمنٹن کورٹ کے جال کا کام بھی کرتے۔ دونوں جانب سے پتھر پھینکے جاتے جو اکثر و بیشتر پنڈتوں کی چھتوں پر بچھی ٹین کی چادروں پر بموں کی طرح گرتے۔ خوف و دہشت کا عجب سماں بندھ جاتا۔

ایک روز روزنامہ آفتاب میں چھپی کسی خبر پر ہنگامہ ہوا۔ پورے علاقے میں تناؤ بڑھ گیا اور دونوں فرقے ایک دوسرے کے خلاف صف آرا ہو گئے۔ دن بھر نعرے بازی اور پتھراؤ چلتا رہا اور شام ڈھلتے ہی بکروں کے ایک مکان سے آگ نمودار ہو گئی۔ ان بھیانک شعلوں میں اسمال کو ایک ہیولا سا نظر آیا۔ اسے یوں لگا کہ کوئی بے بس لڑکی مدد کے لیے باہیں پھیلا رہی ہے۔ نہ جانے کہاں سے اس کی جان میں طاقت عود کر آئی اور وہ سرعت سے آگ کی لپٹوں کا مقابلہ کرتے ہوئے اس ننھی سی جان کو اپنی گود میں اٹھا کر باہر لے آیا۔ لڑکی بچ تو گئی مگر اس کے ضعیف والدین آگ کی نذر ہو گئے۔ تماشائی اسمال کو دیکھتے ہی رہ گئے۔ انہیں حیرت ہوئی کہ لنگڑپن کے باوجود اس نے لڑکی کو بچا لیا اور وہ بھی ایسی لڑکی کو جو مخالف فرقے سے تعلق رکھتی تھی۔

اسمال یتیم لڑکی کو اٹھا کر اپنے گھر لے آیا۔ بھائی بندھوؤں نے اعتراض کیا مگر اس

نے کسی کی نہ سنی۔ وہ فاطی کے لیے کچھ بھی کرنے کو تیار ہو گیا۔ اس نے آبائی گھر چھوڑ کر دوسری جگہ سکونت اختیار کرلی۔

''جلنے دیا ہوتا۔ کیا ضرورت تھی مجھے بچانے کی......؟'' فاطی نے یہ سوال کئی بار اس سے پوچھا۔ وہ آہستہ آہستہ بلوغت کی طرف قدم بڑھا رہی تھی مگر ماضی کی یادیں اس کا پیچھا چھوڑ نہیں رہی تھیں۔

''کیوں جلنے دیتا۔ اوپر والے کے سامنے بھی تو جواب دینا پڑے گا''۔

''جنہوں نے آگ لگائی، کیا انہیں جواب نہیں دینا پڑے گا؟''۔

''ان کی تو وہی جانیں۔ میں نے جو صحیح سمجھا کرلیا۔''

''تم اتنا بھی نہیں سمجھتے میں تمہاری دشمن ہوں۔ مخالف فرقے سے تعلق رکھتی ہوں۔ میری وجہ سے تمہارے بھائی بندھو بچھڑ گئے۔ سبھی فرقے کے لوگ تم سے خار کھائے بیٹھے ہیں۔ کہیں تمہیں کچھ ہو گیا تو......؟''

''ارے پگلی، خدا پر بھروسہ رکھو۔ کچھ نہیں ہوگا۔ اس نے کمانے کے لیے دو ہاتھ دیے ہیں۔ میں کسی کا محتاج نہیں۔ ہاں بچپن میں حادثے میں ٹانگ ٹوٹ گئی تھی ورنہ میں کسی سے کم نہیں ہوں۔''

''اسمال اس دنیا میں اب میرا کوئی نہیں۔ تم مجھ کو چھوڑ کر مت جانا۔'' فاطی کی التجا میں بے بسی صاف طور پر جھلکتی۔

''پھر وہی بات۔ تم اپنے دل سے یہ سارے وسوسے نکال لو۔ جب تک میں زندہ ہوں تم پر آنچ نہیں آنے دونگا۔'' اسمال اس کی ڈھارس بندھا دیتا۔

سچ تو یہ ہے کہ اس سانحے نے اسمال کو قبل از وقت بالغ بنادیا تھا۔ اسے بہ خوبی احساس تھا کہ فاطی اب اس کی منکوحہ بیوی ہے جو اسے ٹوٹ کر پیار کرتی ہے۔ حالانکہ اس شادی کے باعث وہ دونوں اپنے رشتہ داروں سے کٹ کر رہ گئے تھے۔ نہ ان کی خوشی میں شریک ہوسکتے تھے اور نہ ہی ان کے غم میں۔ اس لیے ایک دوسرے کو سہارا دینا نفسیاتی ضرورت بن گئی تھی۔ اسمال نے یتیم فاطی کی زمین بیچ کر اور اپنے دوستوں سے ادھار مانگ کر اچھی خاصی رقم جمع کرلی۔ اس سے ایک برق رفتار سفید گھوڑا اور ایک خوبصورت تانگہ خرید لیا۔ گھوڑے کا نام 'نواب' رکھا اور پہلے ہی روز اپنی دل رُبا کو ڈل جھیل کے کنارے واقع مغل باغات کی سیر کرائی۔ وہ شرماتی لجاتی تانگے کی پچھلی سیٹ پر گٹھڑی کی مانند بیٹھی رہی۔ اسے پہلی بار احساس ہوا کہ دنیا اتنی خوبصورت ہوتی ہے۔

غریبوں کی آرزوئیں ہوتی ہی کتنی ہیں۔ بس پیٹ بھرنے کے لیے دو چار نوالے۔ ستر پوشی کے لیے دو گز کپڑا اور دل بہلانے کے لئے تھوڑی بہت تفریح۔ اس محدود دائرے میں رہ کر پوری زندگی بسر ہو جاتی ہے۔

اس روز کے بعد گھوڑے کی دیکھ بھال کرنا، وقت پر اس کو چارا ڈالنا، ناند میں پانی بھرنا اور اس کی لید صاف کرنا فاطی کا معمول بن گیا۔ وہ بہ خوشی یہ سارے کام نپٹا لیتی۔ اُدھر اسمال صبح سویرے ناشتہ کرنے کے بعد تانگہ جوت لیتا۔ رنگ روغن اور براسو سے اس کو چمکاتا اور پھر شہر کی سڑکوں پر دن بھر اسے دوڑاتا۔ کیا مجال کہ اس نے کبھی بھی نواب پر چابک مارا ہو۔ نواب اور اسمال کے تانگے کی دھوم سارے شہر میں تازہ خوشبو کی طرح پھیل گئی۔

بہر حال اسمال کی شخصیت کا ایک تاریک پہلو بھی تھا۔ وہ بہت غصیلا آدمی تھا۔ بات بات پر جھگڑتا، خاص کر جب وہ شراب کے نشے میں ہوتا۔ اس وقت اس کی بیوی اور بچے بید کی مانند کانپتے۔ بچے تو آنکھیں بچا کر کونوں میں دبک جاتے لیکن وہ سارا غصہ اپنی

بیوی پر اتار دیتا۔ فسادات کے دنوں میں وہ اور بھی بھڑک اٹھتا۔ افراتفری کے سبب بے کاری بڑھ جاتی۔ آمدنی کے سوتے سوکھ جاتے۔ جیبیں خالی ہو جاتیں اور ان کے ساتھ ہی خالی ہو جاتے اس کے دل و دماغ۔ اپنے خالی پن کو دور کرنے کی خاطر وہ شراب کا سہارا لیتا اور پھر نشے کی حالت میں آپے سے باہر ہو جاتا۔ ادھر قرض خواہوں کے تقاضے بڑھتے اور ادھر بچوں کی ضرورتیں۔ آسمان چھوتی ہی مہنگائی میں ایک طرف چار بیٹیوں کا پیٹ پالنا اور دوری طرف گھوڑے کے چارے کا انتظام کرنا بہت مشکل ہو جاتا۔ نتیجتاً وہ فاطی پر برستا۔ پھر گھر میں بیچ بچاؤ کرنے والا بھی تو کوئی نہ تھا۔

یہی وہ وقت ہوتا جب فاطی بکرا فرقے کی نمائندہ بن جاتی جیسے فسادات اس کی شہ پر ہو رہے تھے۔ اس صورت میں اسمال اس کو اپنا کٹر دشمن تصور کرتا۔ نشے میں وہ یہ بھی بھول جاتا کہ فاطی کو پانے کے لیے اس نے طرح طرح کی اذیتیں جھیلی تھیں۔

بے پناہ محبت نفرت کی شدت میں تبدیل ہو جاتی اور بعض اوقات شعور کی حد پار کر جاتی۔

''سالی، حرامجادی، تم نے مجھے کہیں کا نہ رہنے دیا۔ نہ گھر کا...... نہ گھاٹ کا ...... ماں باپ بھائی بہن سب بچھڑ گئے۔ اپنی جماعت میں میری کوئی وقعت نہیں رہی ...... اور تم ...... تم کو تو بس روپے کی پڑی ہے۔ کہاں سے لاؤں گا میں روپے۔ چار دن سے کام ٹھپ پڑ چکا ہے۔ اُدھر تیرے ماں جایے سڑکوں پر نکل آئے ہیں۔ بلوا کر رہے ہیں۔ شیروں سے مقابلہ کرنے نکلے ہیں۔ مادر...... سارے شہر میں کرفیو لگا ہوا ہے۔''

ان پڑھ فاطی کو ان باتوں سے کیا سروکار۔ وہ کیا سمجھے کہ گھر کے باہر مرد کن کن مصیبتوں سے جوجھتا رہتا ہے۔ اُسے لگتا تھا کہ اسمال دنیا کا واحد طاقت ور آدمی ہے، جو کسی بھی مصیبت سے لڑ سکتا ہے۔ آسمان سے تارے توڑ کر لا سکتا ہے۔ پھر دو چار روپے لانے

میں کون سی قباحت ہے۔ اگر آمدنی نہیں ہے تو کسی سے ادھار مانگ لے جہاں سے شراب کے لیے روپے آتے ہیں، وہیں سے گھر کے لیے بھی آئیں گے۔

''نشے میں ہی پڑے رہو گے یا کچھ گھر کی پھکر بھی کرو گے۔'' فاطی بعض اوقات بوکھلا اٹھتی۔

''اور کرنے کو رہا ہی کیا''۔ اسمال ٹکا سا جواب دیتا۔

''ارے، باہر جا کر دیکھ تو لے۔ شاید کرفیو میں ڈھیل دی گئی ہو۔ بازار کھل گیا ہو۔ دنگے ختم ہو چکے ہوں۔ لوگ باگ باہر نکل رہے ہوں۔ تم جب گھر کے باہر قدم رکھو گے تبھی تو پتہ چلے گا۔''

''حرام خور، میں کیا اپنی مرضی سے گھر میں بیٹھا ہوں۔ یہ تمہارے ہی تو رشتے دار ہیں، جو آئے روز دنگا کرتے ہیں۔ اس بار تو مولوی کے آدمیوں نے ہی آگ لگائی تھی۔''

''میں کیا جانوں مولبی کون ہوتا ہے۔ میرا تو سب کچھ تو ہی ہے۔ بھوکی بھی رکھے گا تو ایسے ہی پڑی رہوگی۔ مگر ان بچیوں کی تڑپھ دیکھی نہیں جاتی۔ سو میں چلاّتی ہوں۔''

ہر بار جھگڑے کی ابتداء طعنے مہنے سے ہو جاتی، پھر اسمال مغلظات پر اتر آتا جو کسی بھی ذی روح کے لیے ناقابلِ برداشت ہوتا۔ جب حد سے گزر جاتی تو فاطی پر جنون کا دورہ پڑ جاتا۔ وہ اینٹ کا جواب پتھر سے دیتی۔ آخر نوبت مار پیٹ تک پہنچ جاتی۔ گھونسے لاتوں کا تو حساب ہی نہیں رہتا۔ بارہا اسمال سوٹی لاٹھی سے بھی گریز نہیں کرتا۔ اس نے کسی مولوی دوست سے سنا تھا کہ عورت کو اس طرح رام کرنا مذہب میں جائز ہے۔ نتیجے میں فاطی کے بدن پر نیلے داغوں کی گل کاری ہو جاتی۔ وہ درد کے مارے گھنٹوں بلبلاتی رہتی۔

لڑکیاں ماں کی یہ حالت دیکھ کر اس کے اردگرد حفاظتی حلقہ بنا لیتیں اور اس کو مزید

مار کھانے سے بچا لیتیں۔ کبھی کبھار سوٹی کی مار انہیں بھی کھانی پڑتی۔ اس وقت فاطی کو ایسا لگتا جیسے یہ ضربیں اس کے جگر کے ٹکڑے کر رہی ہیں۔

''آ گئی حرام زادیاں۔ پتا نہیں کس کا تخم ہیں۔ کوئی کام نہ دھام۔ بس کھانا پینا اور گل چھرے اڑانا!'' اسمال بیٹیوں کا برتاؤ دیکھ کر جھلّا اٹھتا۔

''دیکھو جو بھی کہنا ہے مجھ سے کہو۔ ان بے چاری کسمت کی ماریوں کو مت مارو۔ انہوں نے تمہارا کیا بگاڑا۔'' فاطی اسمال سے مخاطب ہوتی۔

''یہی تو ہیں جن کے باعث گھر میں اکال پڑا ہوا ہے۔ چلی آئی ایک کے بعد ایک۔''

''او جی، بچے تو کُھدا کی دین ہوتے ہیں۔ ان کو کیوں کوستے ہو''۔

''ہونہہ۔ خُدا کے پاس کیا لڑکا نہیں تھا۔ بس یہی لڑکیاں بچی تھیں میرے لیے۔ لڑکا ہوتا کم سے کم ہاتھ تو بٹا لیتا۔ دو چار آنے کما کر لاتا۔'' وہ اور بھی زور سے غرّانے لگتا۔

اس جھگڑے کی انتہا تب ہوتی جب لفظوں کی یہ جنگ عملی صورت اختیار کر لیتی۔ زدوکوب کے بعد آخر کار اسمال اپنی بیوی کی چوٹی پکڑ کر اسے گھر سے باہر دھکیل دیتا۔

''جاؤ، حرامجادی جہاں جانا ہے۔ جہنم بنا لیا ہے میری زندگی کو۔ جاؤ، چلی جاؤ۔ اب تم اس گھر میں رہنے کے لائق نہیں ہو۔''

لڑکیاں ششدر رہ جاتیں۔ وہ جلدی سے اپنی ماں کے دو چار کپڑے سمیٹ کر اس کے ساتھ لپٹ جاتیں۔ ٹوٹی ہوئی فاطی کے بوجھل قدم آہستہ آہستہ خالوزاد بہن کے گھر کی جانب اٹھتے۔

آگے آگے فاطی چلتی اور پیچھے پیچھے کم سن بیٹیاں۔ایسا لگتا ہے جیسے کسی ڈربے کی قید سے کوئی مرغی چھوٹ گئی ہو اور اس کے چھوٹے چھوٹے چوزے اس کا تعاقب کر رہے ہوں۔عجیب دلگداز منظر ہوتا۔

شیر بکرے کے ان جھگڑوں نے ہر بار فاطی سے اس کا گھر بار چھین لیا۔اس کو ان ناموں سے نفرت ہونے لگی۔آئے دن کی لعن طعن اور مار پیٹ نے اس کے ذہن میں تنہائی اور بے بسی کا احساس جگایا تھا۔وہ اسی احساس کے بوجھ تلے سوکھ کر کانٹا ہو گئی تھی۔اب تو وہ نفسیاتی مرض میں بھی مبتلا ہو گئی تھی۔اگر بیٹیوں کا سہارا نہ ہوتا شاید وہ اب تک پاگل خانے میں بھرتی ہو چکی ہوتی۔اس چھوٹی سی ہجرت کے دوران وہ خود سے کئی سوال پوچھ لیتی۔اپنی ہستی کے بارے میں، اپنے مستقبل کے بارے میں یا پھر عورت کی حیثیت کے بارے میں۔

''کیا میرے ساتھ یہ سب اس لیے ہو رہا ہے کہ میں بے سہارا عورت ہوں؟ کیا میرا اپنا کوئی گھر نہیں......؟ کتنی بار میں اجڑی ہوں اور کتنی بار مجھے بسایا گیا......؟ کیا میرا کوئی وجود ہی نہیں......؟ کیا عورت کا کہیں کوئی گھر نہیں ہوتا جسے وہ اپنا سمجھے اور، اپنا کہے۔''

اس کے پاس ان سوالوں کا کوئی جواب نہیں تھا۔تھک ہار کر وہ چپ ہو جاتی اور حالات سے سمجھوتا کر لیتی۔

فسادات ختم ہوتے ہی زندگی پھر اپنے ڈھرے پر آجاتی۔وہ چار روز میں سب کچھ معمول پر آجاتا۔لیکن اسمال کے گھر میں پھر بھی ویرانیوں کا بسیرا رہتا۔گھوڑے کی ہنہناہٹ اسے کچوٹتی، نواب اپنی مالکن کو ڈھونڈتا رہتا۔اسمال خود ہی اس کے سامنے کھلی، بھوسا یا پھر گھاس ڈال دیتا۔اس کے کونڈے میں پانی بھر دیتا مگر نواب تھا کہ روٹھا ہی رہتا۔ چارے کو منہ بھی نہ لگاتا۔دن بھر تانگے میں جتنے کے باوجود گھر آکر وہ غمگین رہتا اور صدر دروازے کی طرف ٹکٹکی باندھے اپنی مالکن کا انتظار کرتا۔

ایسا نہیں تھا کہ اسمال کو اپنے کیے پر پچھتاوا نہیں ہوتا۔ رات بھر وہ اسی سوچ میں پڑا رہتا کہ آخر کیوں اس نے فاطی کو گھر سے نکال؟ فاطی کا قصور کیا تھا؟ وہ خود اس کے گھر میں تو نہیں آئی تھی۔ اسے سمجھ نہیں آتا تھا کہ بار بار وہ ایسی غلطی کیوں کر بیٹھتا ہے۔ اس نے کتنی بار توبہ کر لی۔ قسمیں کھائیں کہ مستقبل میں پھر کبھی ایسا نہیں کرے گا۔ اس کے باوجود وہ بار بار اس فعل کو دہراتا۔ اور پھر غصہ ٹھنڈا ہوتے ہی بیوی اور بچوں کو یاد کرنے لگتا۔

جھینپتا شرماتا وہ فاطی کی خالہ زاد بہن کے گھر چلا جاتا۔ منت سماجت کرتا۔ فاطی کے سامنے گڑ گڑاتا اور اپنی غلطی قبول کر لیتا۔

''بہن۔ اس کو سمجھاؤ۔ آخر اس کا گھر تو وہیں ہے۔ یہاں کتنی دیر بیٹھی رہے گی۔'' اسمال فاطی کی خالہ زاد بہن سے مخاطب ہوتا۔

''وہ کیا سمجھائے گی موئے۔ تم تو جنگلی درندے ہو۔ تمہارے ساتھ میں نہیں جاؤں گی۔''

''ارے اب معاف بھی کرو۔ جو ہوا سو ہوا۔ اب چلو گھر چلیں۔''

''کون سے گھر؟ میرا کوئی گھر نہیں۔ میرا گھر تو بچپن ہی میں جل گیا تھا۔ اسی کے ساتھ جل گئے تھے میرے ماں باپ۔ اور میرے ارمان......! میں یتیم ہوں۔ یتیموں کا کوئی گھر نہیں، ہوتا''۔

''تمہاری بات صحیح ہے۔ لیکن شادی کے بعد تو سسرال ہی تمہارا گھر ہے۔ اب چلو بھی۔ میری خاطر نہیں کم سے کم نواب کی خاطر ہی چلو۔ وہ تمہارے بغیر تڑپ رہا ہے۔ وہ کچھ کھاتا ہے نہ پیتا ہے۔ بس صدر دروازے کی طرف آنکھیں پھاڑ کر دیکھتا رہتا ہے۔''

نواب کا واسطہ دینا ہی فاطی کی دکھتی رگ پر ہاتھ رکھنے کے برابر ہوتا۔ فاطی کی

آنکھوں سے جھرنا بہنے لگتی۔ روتی آواز میں وہ اپنے شوہر سے کہتی۔

''میں تو تمہارے ساتھ آؤں گی مگر مجھے معلوم ہے کہ دوسرا فساد ہوا نہیں اور میں پھر گھر سے بے گھر ہو جاؤں گی۔ ان بچیوں کے لیے میں یہ اہانت بھی سہنے کو تیار ہوں۔''

لڑکیاں پہلے ہی گھر جانے کے لیے تیار کھڑی ہوتیں۔ بڑی لڑکی ماں کے کپڑوں کو اخبار میں لپیٹ کر دروازے پر انتظار کرتی اور پھر فاطی کی ایک اور بدھائی ہوتی۔ بینڈ باجے کے بدلے رونے کی آوازیں اس کا تعاقب کرتیں۔

پھر ایک فساد سے لے کر دوسرے فساد تک فاطی کا گھر بس جاتا۔ واپسی پر اس کے من میں طرح طرح کے سوال پیدا ہوتے۔

''عورت بھی کتنی لاچار ہوتی ہے! اتنی بے عزتی اور زدوکوب کے بعد بھی میں اسی چوکھٹ پر سجدہ دینے جا رہی ہوں! کیا معلوم کب تک وہاں رہ پاؤں گی......؟ نواب اور یہ لڑکیاں نہ ہوتیں، میں کب کی دریائے جہلم میں کود گئی ہوتی۔ اسمال کو شاید میری ان کمزوریوں کا اندازہ ہو چکا ہے۔ ہر بار نواب کا واسطہ دیتا ہے۔''

چلتے چلتے وہ کئی بار پتھروں سے ٹکرانے کے باعث لڑکھڑاتی مگر دفعتاً اپنے آپ کو سنبھالتی اور پھر اسی تصور کے عالم میں کھو جاتی۔ یہ سلسلہ تب تک چلتا رہتا جب تک وہ نواب کی ہنہناہٹ نہ سنتی۔ اس کی جان میں جان آجاتی اور وہ دوڑ کر اسے گلے لگا لیتی۔ موٹے گرم آنسو نواب کی گردن کے بالوں میں جذب ہو جاتے۔

فاطی کئی بار گھر سے بے گھر ہوئی۔ ہر بار وہ بچوں کو لے کر شوہر کو کوستی ہوئی سسرال سے نکل جاتی۔ بچوں کے ہاتھ میں پوٹلی ہوتی جس میں دو چار پھٹے پرانے کپڑوں کے سوا اور کچھ نہ ہوتا۔ یہ پوٹلی فاطی کو بہت عزیز تھی۔ یہی اس کی زندگی کی پونجی تھی جس پر وہ اپنا حق

سمجھتی تھی۔ باقی سب کچھ پرایا معلوم ہوتا۔"

تعجب تو اس بات کا تھا کہ اتنا سب کچھ ہونے کے باوجود اسمال نے کبھی طلاق دینے کی کوشش نہیں کی۔ اس وقت بھی نہیں جب اس کا غصہ انتہا کو پہنچ جاتا۔ شاید اس کے ذہن میں یہ بات کہیں رچ بس گئی تھی کہ حالات نارمل ہوتے ہی سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا۔ اور گھر میں پھر وہی شور غل مچ جائے گا۔

اسمال اور فاطی کی چاہت اور نفرت کی انوکھی داستان یہیں پر ختم نہیں ہوتی۔ گذشتہ سال فاطی کے پیٹ میں شدید درد اٹھا۔ وہ رات بھر تڑپتی رہی۔ درد کے مارے اس نے آسمان سر پر اٹھالیا۔ اس سے پہلے بھی فاطی کئی بار بیمار ہو چکی تھی، چار لڑکیوں کو جنا تھا مگر ایسا درد اس نے پہلے کبھی محسوس نہ کیا تھا۔

اسمال بھی حیرت زدہ تھا۔ بیٹیاں ماں کی کراہٹ سن کر خوف زدہ ہوگئیں۔ وہ فاطی کی تیمارداری میں لگ گئیں۔ اسمال نے رات میں کئی بار نماز ادا کی۔ سبھی نے آنکھوں میں رات کاٹ لی۔

پو پھٹتے ہی اسمال نے اپنا تانگہ جوتا اور فاطی کو پچھلی سیٹ پر بٹھالیا۔ بیٹیاں بھی ساتھ میں ہولیں۔ باہر دفعہ ۱۴۴ لگا ہوا تھا۔ ماحول میں تناؤ صاف نظر آرہا تھا۔ اکادکا آدمی سڑکوں پر سہم سہم کر چل رہے تھے۔ سڑکوں پر پتھر، اینٹیں، پھٹی چپلیں اور ٹوٹی ہوئی کانگڑیاں جابجا بکھری پڑی تھیں۔ شیروں اور بکروں میں کل رات سے پھر لڑائی چھڑ گئی تھی۔ کہیں کسی موڑ پر چند ایک پولیس والے بھی نظر آرہے تھے۔ اسمال نے کسی کی پرواہ نہ کی۔ وہ جان کی بازی لگا کر تانگے کو برق رفتاری سے بھگائے جارہا تھا۔ پہلی بار وہ چہیتے نواب پر کوڑے برسا رہا تھا۔ اس کے سر پر جنوں سوار تھا کیونکہ وہ اپنی بیوی کو مرتا نہیں دیکھ سکتا تھا۔

آخر کار وہ اسٹیٹ اسپتال پہنچ گیا۔ فاطی کو آئی سی یو میں داخل کرایا۔ پیشاب اور خون کے ٹیسٹ کرائے۔ سونوگرافی اور ایکسرے فوٹو کھنچوائے۔ پھر اسپیشلسٹ ڈاکٹروں کی ٹیم نے معائنہ کیا۔ مرض کی تشخیص کی۔ معلوم ہوا کہ فاطی کے دونوں گردے ناکارہ ہو چکے ہیں۔

''تمہاری بیوی کے دونوں گردے خراب ہو چکے ہیں۔'' ایک ڈاکٹر نے اسمال کو اپنے پاس بلاتے ہوئے اطلاع دی۔ اسمال پر بجلی سی گری۔ وہ دم بہ خود ڈاکٹر کو دیکھتا رہا جیسے کہہ رہا ہو کہ میری سمجھ میں کچھ بھی نہیں آرہا ہے۔

''اگر کوئی رشتے دار اپنا ایک گردہ عطیے میں دے سکتا ہے تو امید ہے مریضہ بچ جائے گی۔ اور ہاں، یہ اسپتال تو گورنمنٹ کا ہے مگر کچھ ادویات وغیرہ آپ کو بازار سے خریدنی پڑیں گی۔ پھر خون کا انتظام بھی کرنا پڑے گا۔''

صاحب، میں تو غریب آدمی ہوں۔ اس میں کتنا خرچہ لگ سکتا ہے۔''

''یہی کوئی بیس پچیس ہزار!''

ڈاکٹر کی بات سن کر اسمال پریشان ہو گیا۔ ''کون دے گا گردہ! فاطی کا کوئی قریبی رشتے دار تو ہے نہیں جو اپنا گرُدہ دے۔ گردہ یا تو میں دے سکتا ہوں یا پھر بیٹیاں! وہ اپنے سے باتیں کرنے لگا۔ بیٹیوں کا تصور کرتے ہی اس کے بدن میں جھرجھری سی پیدا ہو گئی۔ ''انہوں نے تو ابھی زندگی دیکھی بھی نہیں۔ پھر ان کو گردے سے محروم کرنا بہت بڑا گناہ ہوگا۔''

فاطی کو بیٹیوں کی دیکھ ریکھ میں چھوڑ کر اسمال تانگہ لے کر چل پڑا۔ پہلے تو قرضہ لینے کی کئی جگہ کوشش کی مگر ہر جگہ ناکامی ہاتھ لگی۔ اس کو ایسا لگا جیسے رات بھر ہی میں ساری کائنات بدل چکی ہو۔ کوئی چہرہ شناسا نہیں لگ رہا تھا۔ مجبوراً وہ اس بازار میں پہنچ گیا جہاں

تانگوں اور گھوڑوں کی تجارت ہوتی تھی۔ بیس ہزار میں سودا طے ہوا۔ اس نے نم آنکھوں سے نواب کی پیشانی چوم لی اور اس کو خریدار کے حوالے کر دیا۔

"صاحب! نواب میرا گھوڑا نہیں ہے، یہ میرا بیٹا ہے۔ اس کو میں نے اپنے خونِ جگر سے پالا ہے۔ میں اپنا بیٹا آپ کے حوالے کر رہا ہوں۔ اس کا خیال رکھ لینا۔"

وہ مڑا اور پھر پلٹ کر نواب کو دیکھنے کی ہمت بھی نہ جٹا پایا۔ اسپتال پہنچتے ہی اس نے ساری رقم اپنی بڑی بیٹی کے حوالے کر دی اور خود ڈاکٹر سے درخواست کی کہ اس کا گردہ فاطی کے جسم میں منتقل کر دیں۔

اس نے اپنا روزگار اور مستقبل دونوں داؤ پر لگا دیے۔

رات بھر دونوں میاں بیوی زندگی اور موت سے جوجھتے رہے۔ ڈاکٹروں نے اسمال کا گردہ نکال کر فاطی کے جسم میں ٹرانسپلانٹ کر دیا۔ آپریشن کامیاب ہوا۔

پھر صبح کا سورج نئی امیدیں لے کر طلوع ہوا۔ اسپتال کے ایک بیڈ پر فاطی بے ہوش پڑی ہوئی تھی اور دوسرے بیڈ پر اس کا شوہر۔

کئی گھنٹے گزر جانے کے بعد دونوں کو ہوش آیا دونوں کی نگاہیں ایک دوسرے کو تلاش رہی تھیں۔ بکرے کے جسم میں شیر کا گردہ دہاڑ رہا تھا۔ سامنے چاروں بیٹیاں خاموش اپنے ماں باپ کے زرد چہروں کو یوں تک رہی تھیں جیسے انہیں اپنی آنکھوں پر یقین ہی نہ آ رہا ہو۔

☆☆☆

آجادی

غلام نبی شاہد

شہر میں جاری کرفیو کے ساتویں روز صبح سویرے کچھ حساس علاقوں میں فوج کی ٹکڑیوں میں مزید اضافہ کیا گیا۔ پندرہ افراد پر مشتمل ایک ٹکڑی میں شامل انسپکٹر سریندر کو دریش کدل پر تعینات کیا گیا۔ سریندر پچھلے ڈیڑھ سال سے متواتر شہر کے مختلف علاقوں میں رات دن اپنی ڈیوٹی بڑی خوش اسلوبی سے انجام دے چکا ہے۔ اپنی چار سال کی ننھی بچی کنول کا پھول کا سا چہرہ ہر وقت ذہن میں گھومتا رہتا ہے۔ ایک مہینہ پہلے چھٹی کے لیے درخواست دی ہے، تب سے بھگوان سے درخواست منظور ہونے کی پرارتھنا کر رہا ہے۔ صبح گاڑی سے اترتے ہی اندر پرارتھنا میں مگن تھا کہ اچانک آس پاس کی گلیوں، مکانوں، دکانوں سے دھوپ کا ایک بڑا ریلا کرفیو توڑ کر اس کے دائیں بائیں سامنے دریش کدل کے آر پار دور تک پھیل گیا۔ چند لمحے وہ تذبذب میں مشکوک نظروں سے دھوپ کو دیکھتا رہا۔ پھر قدرے اطمینان ہوتے ہی ماحول کا جائزہ لینے لگا۔ وہ پل کے سرے پر کھڑا تھا۔ دائیں بائیں مکان، دکانیں، سامنے سڑک، نیچے پانی میں ٹھہرے ڈونگے سب ساکت تھے۔ کسی میں کوئی حرکت نہ دیکھی۔ نیچے دریا کے کنارے پر کھلنے والی گلیوں کے دہانوں پر بیٹھے آوارہ کتے اپنی تھوتھنیاں اگلی ٹانگوں میں دبائے آس پاس کے ماحول کا پورا پورا ساتھ دے رہے تھے۔ کرفیو پر سختی سے عمل ہو رہا ہے۔ یہ سوچتے ہی اسے قدرے اطمینان ہوا۔ اس دوران دوسرے ساتھی گشت پر نکلے تھے۔ اس نے رائفل کندھے سے اتار کر ہاتھ میں لی اور دائیں بائیں نظریں دوڑاتا پُل کی دوسری جانب بڑھنے لگا۔ ابھی چند ہی قدم بڑھائے کہ کہیں سے رونے کی آواز سن کر وہیں رک گیا۔ رونے کی آواز آس پاس سے ہی آ رہی تھی۔ غور سے

دائیں بائیں دیکھا۔اسے لگا آس پاس کے سارے مکان، دکانیں، سامنے سڑک، گلیاں، نیچے دریا اور ڈونگوں کے ساتھ ساتھ دریا کے کناروں پر کتے سب ایک ساتھ رو رہے ہیں۔ اسی اثنا میں پولیس کی ایک جیپسی پل پر سے تیزی سے گزر گئی جس کے شور میں اس کے محسوسات اور رونے کی آواز ایک ساتھ دب سے گئے۔ دوسرے ہی لمحے ماحول پھر ساکت ہو گیا۔ وہ چند قدم اور آگے بڑھا جس کے ساتھ ہی رونے کی آواز بھی بڑھنے لگی اور صاف سنائی دینے لگی۔ کوئی بچہ بلک بلک کر رو رہا تھا۔ تذبذب میں ادھر اُدھر دیکھنے لگا جیسے اندازہ کرنا چاہتا ہو کہ آواز کہاں سے آ رہی ہے۔ سڑک پار کی اور دوسری جانب مکانوں کی طرف ٹھہر ٹھہر کان لگائے۔ مگر کچھ اندازہ نہ کر سکا۔ واپس مڑ کر پھر سڑک پار کی اور غور سے رونے کی آواز سننے لگا۔ دوسرے ہی لمحے اسے یقین ہو گیا کہ آواز پل کے نیچے سے آ رہی ہے۔ قدرے جھکتے ہوئے نیچے ڈونگوں کی طرف دیکھا۔ چند لمحے اسی طرح غور سے دیکھتا رہا۔ اس دوران ٹھیک سے انداز ہو گیا کہ رونے کی آواز پہلے ڈونگے سے آ رہی ہے۔ پھر اچانک کچھ یاد آتے ہی وہ مستعدی سے سیدھا کھڑا ہو گیا۔ رائفل کو مضبوطی سے پکڑا، دائیں بائیں دور تک نظریں دوڑائیں۔ کرفیو برابر سختی سے نافذ تھا۔ اسے قدرے اطمینان ہوا۔ لیکن رونے کی آواز برابر اس کے کانوں کو چیر رہی تھی۔ پھر مڑ کر نیچے ڈونگے کی طرف دیکھا۔ تذبذب میں فیصلہ نہیں کر پا رہا تھا کہ کیا کرے۔ بچہ بلک بلک کر رو رہا تھا۔

''شاید بہت بیمار ہے'' اس نے کھڑے کھڑے ایک لمحے کے لئے سوچا......

''میں کیا کر سکتا ہوں'' خود سے بڑبڑاتے ہوئے اس نے واپس مڑنا چاہا لیکن اسے محسوس ہوا اس کے کے پاؤں اس کا ساتھ نہیں دے رہے ہیں۔ ایک لمحے کے لئے وہ ساکت ہو گیا۔ ذہن میں کنول کا چہرہ گھوم گیا۔ جس کے ساتھ ہی وہ حرکت میں آ گیا اور مڑ کر نیچے ڈونگے کی جانب دیکھنے لگا۔ پھر سامنے گلی کی طرف جو سڑک سے اتر کر ڈونگے کے سامنے

کنارے پر کھلتی تھی، وہ آگے بڑھا اور پل پار کرتے ہی دائیں طرف گلی میں مڑ گیا اور رونے کی آواز کے تعاقب میں تیز تیز قدم اٹھاتے ہوئے چند لمحوں میں ڈونگے کے سامنے کنارے پر کھڑا ہو گیا۔ رونے کی آواز قریب سے سننے پر اسے محسوس ہوا جیسے کنول کا رونا بھی اس میں شامل ہے۔ اس نے رائفل کو سیدھا کر کے ڈونگے کی کھڑکی پر زور سے ایک دوبار دستک دی۔ جس کے ساتھ ہی رونا بند ہو گیا اور ہلکی آواز کے ساتھ ہی کھڑکی کھلی۔ سامنے فوجی کو دیکھ کر قادر کی جیسے روح نکل گئی۔ اس کا گلا سوکھ گیا۔ اس سے پہلے وہ غش کھا کر گر پڑتا سریندر نے قدرے نرمی سے پوچھا "بچہ کیوں رو رہا ہے، بیمار ہے؟ نہیں! بیمار نہیں، بھوکا ہے۔ پرسوں سے کچھ کھایا نہیں، تھوڑے چاول تھے ختم ہو گئے۔ اب...... قادر مشکل سے اتنا ہی کہہ پایا کہ بچے نے قادر کے کندھے سے سر اٹھا کر سریندر کی طرف دیکھا اور پہلے سے بھی زیادہ شدت سے رونے لگا۔ اس بار رونے میں خوف کا عنصر زیادہ تھا۔ سریندر قادر کی جانب غور سے دیکھ رہا تھا۔ قدرے اونچی آواز میں پوچھا۔ چاول کہاں سے ملیں گے۔ "اوپر محی الدین کی دکان سے لیکن میرے پاس...... اتنا کہتے ہوئے قادر کا ہاتھ اوپر اٹھتے ہوئے جیسے وہیں ساکت ہو گیا" سریندر نے اوپر کی جانب دیکھا۔ پھر قادر کی طرف مڑتے ہوئے بولا۔

"کوئی بات نہیں، آؤ میرے ساتھ" کہتے ہوئے سریندر نے سامنے والی گلی کا رخ کیا۔ قادر نے کھڑکی بند کر دی۔ پیچھے کھڑی بیوی کو کچھ سمجھایا اور بچے کو گود میں لے کر سامنے والے دروازے سے نکل کر ڈونگے اور کنارے کے درمیان رکھے ۱۲/انچ چوڑے دیوار کے پھٹے پر ڈولتا ہوا کنارے پر آ گیا۔ بچہ زور زور سے رو رہا تھا۔ اس کے رونے میں اب بھی خوف کا عنصر غالب تھا۔ وہ گلی کے سامنے پہنچ گیا۔ دائیں بائیں دیکھا۔ سامنے گلی کے سوا کچھ نظر نہ آیا۔ ہانپتے ہوئے گلی میں گھس گیا۔ چند ہی لمحوں میں وہ سڑک پر سریندر کے

سامنے کھڑا ہو گیا۔ ''کہاں ہے اس کی دکان''۔ دائیں بائیں دکانوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے پوچھا۔ قادر نے پھولتی سانسوں پر قابو پانے کی کوشش کرتے ہوئے دائیں طرف چند دکانیں چھوڑ کر ایک دوکان کی طرف اشارہ کرتے وہ ہے۔ ''وہ......وہ سرخ شٹر والی......وہ ......محی الدین کی ہے'' سریندر نے محی الدین کی دکان کی طرف غور سے دیکھا۔ پھر مڑ کر قادر سے پوچھا ''ٹھیک ہے۔'''' لیکن یہ رہتا کہاں ہے''۔ اس کا گھر بھی دکان کے ساتھ ہے۔ قادر نے بلکتے بچے کو ایک کندھے سے اٹھا کر دوسرے کندھے پر رکھتے ہوئے کہا۔ ''اچھا آؤ میرے ساتھ''۔ کہتے ہوئے سریندر دکان کی جانب بڑھنے لگا اور قادر پیچھے پیچھے......قریب پہنچ کر سریندر نے اوپر سے نیچے تک پورے مکان اور دوکان کا جائزہ لیا۔ پھر آگے بڑھ کر گلی میں کھلنے والے مکان کے دروازے پر ہاتھ سے دو تین بار دستک دی۔ دوسرے ہی لمحے ایک ادھیڑ عمر کا آدمی دروازے پر کھڑا ہو گیا۔ ''تمہارا نام محی الدین ہے'' سریندر نے قدرے نرمی سے پوچھا۔ ''جی''۔ مشکل سے محی الدین نے جواب دیا۔ ''دکان میں چاول سبزی کچھ ہے''۔ سریندر نے پہلے والے لہجے میں پوچھا......محی الدین نے یہ سن کر اندر ہی اندر راحت کی سانس لیتے ہوئے کہا۔ ''چاول اور پیاز ہے''۔ ''ٹھیک ہے اس آدمی کو تھوڑا چاول اور پیاز دو۔ پیسے بعد میں دے گا، بچہ بھوکا ہے۔'' سریندر نے قادر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا، جو سریندر کے پیچھے کھڑا تھا۔ محی الدین نے ایک نظر قادر اور روتے ہوئے بچے پر ڈالی اور کہا ''ٹھیک ہے چابی لاتا ہوں'' کہتے ہوئے واپس مڑا۔ سریندر دکان کے سامنے کھڑا ہو گیا۔ قادر پورے یقین کے ساتھ بچے کو تسلیاں دینے لگا۔ اس دوران محی الدین نے چابی لے کر دوکان کے تالے کھولے۔ شٹر کھلنے کی آواز کے ساتھ ہی جیسے آس پاس کا سب کچھ حرکت میں آ گیا۔ سریندر خود بھی ہڑبڑا گیا۔ رائفل کو ہاتھوں میں مضبوطی سے پکڑ کر دائیں بائیں کا جائزہ لینے لگا۔ اس دوران سب کچھ پھر پہلی حالت پر آ گیا تھا

''کرفیو پر سختی سے عمل ہو رہا ہے'' سوچتے ہوئے اس۔ نے کھلی ہوئی دکان کی طرف دیکھا۔ محی الدین ایک تھیلے میں چاول بھر چکا تھا۔ قادر بے یقینی سے یہ سب دیکھ رہا تھا۔ اسی دوران بچہ روتے روتے لپک لپک کر محی الدین کی طرف بڑھنا چاہتا تھا۔ قادر اسے تسلیاں دے کر ایک کندھے سے اٹھا کر دوسرے کندھے پر رکھ کر تھپکیاں دے کر خاموش کرنے کی ناکام کوشش کرنے لگا۔ سریندر یہ سب دیکھ رہا تھا۔ وہ آگے بڑھا اور جیب سے دس روپیہ کا نوٹ نکال کر محی الدین کے ہاتھ میں تھما دیا اور سامنے سے ایک چپس کا پیکٹ اٹھا کر بچے کے قریب آ گیا اور چپس کا پیکٹ بچے کے ہاتھوں میں تھماتے ہوئے بولا۔ ''یہ لو، اب تو چپ ہو جاؤ...... چپس کا پیکٹ لے کر بچہ فوراً چپ ہو گیا۔ سریندر بچے کو خاموشی سے دیکھتا رہا پھر قدرے اطمینان سے پوچھا۔ ''شاباش...... اب اور کیا چاہیے'' بچے نے چپس کے پیکٹ سے کھیلتے ہوئے اسی اطمینان سے جواب دیا...... ''آجادی''......!

افسانہ نگاروں کے کوائف

اختر محی الدین

پیدائش : 1928 سری نگر

مشغلہ : ریاستی کلچرل اکادمی

وفات : 2001

افسانوں کے مجموعے : ست سنگر، سونزل، سیون ون نائن سیون ون (71971)

پریم ناتھ پردیسی

پیدائش : 1909، سری نگر

مشغلہ : ریڈیو کشمیر

وفات : 1955

افسانوں کے مجموعے : شام وسحر، دنیا ہماری، بہتے چراغ

پریم ناتھ در

پیدائش : 1913

مشغلہ : صحافت - ہندوستان ٹائمز، آل انڈیا ریڈیو، دہلی۔ آفیسر آن اسپیشل ڈیوٹی

وفات : 1977

افسانوں کے مجموعے : کاغذ کا واسدیو، نیلی آنکھیں، چناروں کے سائے میں (بعد از مرگ)

پشکر ناتھ

پیدائش : 1932 سری نگر

مشغلہ : سرکاری ملازمت

وفات : 2005

افسانوں کے مجموعے : اندھیرے اجالے، ڈل کے باسی، عشق کا اندھیرا، کانچ کی دنیا

ترنم ریاض

پیدائش : 1963 سری نگر

مشغلہ : تخلیقِ نظم ونثر

افسانوں کے مجموعے : یہ تنگ زمین، ابابیلیں لوٹ آئیں گی، یمبرزل، میرا رختِ سفر

حامدی کاشمیری

پیدائش : 1932

مشغلہ : معلم، ریٹائر بطور وائس چانسلر، کشمیر یونیورسٹی

افسانوں کے مجموعے : وادی کے پھول، سراب، برف میں آگ

دیپک کنول

پیدائش : 1949 بڈگام کشمیر

مشغلہ : سکریٹری، فلم اداکار دلیپ کمار

افسانوں کے مجموعے : ہم تیرے ہو گئے، برف کی آگ

دیپک بدکی

پیدائش : 1950 سری نگر

مشغلہ : انڈین پوسٹل سروس

افسانوں کے مجموعے : ادھورے چہرے، چنار کے پنچے، زیبرا کراسنگ پر کھڑا آدمی

علی محمد لون

پیدائش : 1926 سری نگر

مشغلہ : ریڈیو کشمیر

وفات : 1987

افسانوں کا مجموعہ : کوئی شائع نہیں ہوا

عمر مجید

پیدائش : 1940

مشغلہ : معلم اردو (ٹینڈل بسکو اسکول، اسسٹنٹ ایڈیٹر روزنامہ آفتاب)۔

وفات : 2008

افسانوں کے مجموعے : اجالوں کے گھاؤ

غلام نبی شاہد

پیدائش : 1952 سری نگر

مشغلہ : ذاتی کاروبار

افسانوں کے مجموعے : میں نے خواب میں ابابیلیں دیکھیں (زیرِ طبع)

نور شاہ

پیدائش : 1936

مشغلہ : سرکاری ملازمت

افسانوں کے مجموعے : بے گھاٹ کی ناؤ، ویرانے کے پھول، من کا آنگن اداس اداس، ایک رات کی ملکہ، گیلے پتھروں کی مہک، بے ثمر سچ اور آسمان، پھول اور لہو

ویریندر پٹواری

پیدائش : 1940 سری نگر

مشغلہ : انجینئر

افسانوں کے مجموعے : فرشتے روتے ہیں، دوسری کرن، بے چین لمحوں کا سفر، آوازسرگوشیوں کی ایک ادھوری کہانی، اُفق، دائرے

....

جس خاک کے ضمیر میں ہو آتشِ چنار
ممکن نہیں ہے سرد ہو وہ خاکِ ارجمند

(اقبال)

M. R. Publications
Printers, Publishers, Suppliers & Distributors of Literary Books
10 Metropole Market, 2724-25 First Floor
Kucha Chelan, Daryaganj, New Delhi-110002
Cell. 09810784549, 09873156910 E-mail: abdus26@hotmail.com